BIHAR URDU ACADEMY

اپریل ۲۰۲۴ء

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

منتظر سارا عالم تھا جس کی دید کا
چاند وہ نکلا ہے دیکھو عید کا

عید کا یہ چاند لایا ہے نوید خرمی
ٹال اس کی روشنی میں گردش ایام کو

ساقی ہوں تیس دن سے میں مشتاق دید کا
دکھا دے جام مے میں مجھے چاند عید کا

عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم
رسم دنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے

عید سعید

نصیب جن کو ترے رُخ کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں، خوب ان کی عید ہوتی ہے

شاہ و گدا کے دل پہ ہے سکہ جما ہوا
دنیا میں سب سے بڑھ کے ہے جاہ و جلال عید

گلے اک دوسرے سے مل رہے ہیں صاحب ایماں
لباسِ عید میں یہ رحمت پروردگار آئی ہے

ہوتا ہے جس میں رحمت حق کا نزول
فضل خدا سے عید وہ روزِ سعید ہے

شب قدر

یہ شب کہ جو آئی ہے بڑی شان کی شب ہے   ایمان کی ، عرفان کی ، احسان کی شب ہے
یہ شب تو گہرباریٔ قرآن کی شب ہے   تم سوئے ہو اس رات میں یہ کیسا غضب ہے
ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

راتیں ہوں ہزار ، اُن سے یہ اک رات ہے بہتر   یہ رات ہے وہ رات جو دن سے بھی ہے بڑھ کر
یہ رات ہے جس رات میں جاگے گا مقدر   یہ رات گل افشانی رحمت کا سبب ہے
ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

اُمڈا ہوا دریا ہے اِدھر جود و سخا کا   چھایا ہوا ہے ابر اُدھر لطف و عطا کا
یہ رات ہے وہ جس کو مشیت نے ہے تاکا   اس رات کو جو پائے وہی بندۂ رب ہے
ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

اسمٰعیل روحؔ

مولانا سید شاہ اسمٰعیل روحؔ کی تاریخ ولادت یکم اگست ۱۹۲۰ء اور جائے ولادت دانا پور ہے۔ ان کی دادیہال کا کوٹھی اور ان کے والد کا نام شاہ محمد سعید تھا۔ انہوں نے اپنی نانیہال کے ''مدرسہ حنفیہ'' دانا پور میں ابتدائی تعلیم پائی۔ بعدازیں پٹنہ یونیورسٹی سے بی اے اور محکمہ تعلیمات حکومت بہار سے آرٹ آف ٹیچنگ میں ڈپلوما بھی کیا۔ سید شاہ اسمٰعیل کی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت ہیڈ مولوی، ہائی اسکول خسرو پور، پٹنہ میں ملازمت سے ہوا، پھر روآئل اسلامک سوسائٹی آف بنگال کی لائبریری میں کیٹلاگر ہوئے۔ مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ میں مولانا کی ملازمت کا زمانہ ۲۱ نومبر ۱۹۴۸ء سے شروع ہوتا ہے، جہاں ۳۱/اکتوبر ۱۹۷۸ء کو وہ وائس پرنسپل بنائے گئے۔ یہاں کی لازمت سے سبکدوشی کے بعد خدا بخش لائبریری پٹنہ میں عربی مخطوطات کی فہرست سازی پر مامور ہوئے اور لائبریری کی کئی اہم کمیٹی کے رکن بھی نامزد ہوئے۔ وہ عربی مخطوطات کی توضیحی فہرست سازی کے ساتھ لائبریری سمینار میں طبی مخطوطات کے تفصیلی تعارف بھی پیش کیا کرتے تھے، جو بعد میں خدا بخش جرنل میں اشاعت پزیر ہوئے۔ انہوں نے جہاں حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری علیہ الرحمہ کی ''مکتوب صدی'' کی تدوین کی، وہیں تصوف، قرآنیات اور اُردو مخطوطات کی جامع فہرستوں کی ترتیب کا کام بھی کیا۔ ''مفتاح الکنوز'' کی فہرست سازی اور نادر جنتری کی ترتیب وتزئین ان کی یادگار علمی محنتیں ہیں۔ وہ تحقیق وتدوین کے ساتھ ساتھ، خطابت، شاعری، مدارس کے نصاب میں داخل متنوع علوم وفنون کی کتابوں کی تدریس، عربی زبان میں حسب موقع تادیر گفتگو کی صلاحیت اور درس کے دوران طلبا کو مطمئن کر دینے اور اُن میں مطالعہ کا ذوق ابھار دینے کا خاص ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا کی وفات ۲۳، اپریل ۱۹۹۸ء کو سفر حج کے دوران ہوئی اور خوش قسمتی سے جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔ (''بہار کی بہار'' جلد اوّل، مرتبہ ڈاکٹر اعجاز علی ارشد ''زمانہ اس کو بھلا نہ دے'' مصنفہ محمود عالم، مقالہ ''مولانا شاہ اسمٰعیل روحؔ: شخصیت اور فن'' قاسم خورشید، مجلّہ ''زبان وادب'' جنوری، فروری ۲۰۰۷ء سے اخذ واستفادہ کے ساتھ)

زبان و ادب

بہار اردو اکادمی کا ماہانہ مجلّہ

BIHAR URDU ACADEMY

مدیر
ابرار احمد خان
سکریٹری، بہار اردو اکادمی

معاون مدیر
انوار محمد عظیم آبادی

جلد : ۴۵ شمارہ : ۴

اپریل ۲۰۲۴ء

زرتعاون : پندرہ روپے

سالانہ : ایک سو پچاس روپے

ترسیل زر اور خط و کتابت کا پتہ: سکریٹری بہار اردو اکادمی، اردو بھون، چوہٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ (بہار)

فیکس/فون: 0612-2678021 - 2301476
Web : www.biharurduacademy.in

email : zabanoadabbua@gmail.com
buapat2014@gmail.com

کمپوزنگ : پروین اشرفی

تزئین : زیبا پروین

ترتیب

اداریہ	حرف آغاز		ابراراحمد خان	۳
عید سعید	اردو شاعری میں عید کا ذکر		فرد الحسن فرؔد	۴
	عید / عید کا چاند		جوہؔر نوری / ابونصر فاروق صارؔم	۶
	سرد آہوں میں بھی آ جائے حرارت عید کی		عبدالرزاق رضوؔی	۷
	ہلالِ عید		مظہؔر زاہدی	۸
مقالات	بیدی کے افسانوں میں فکری وفنی امتیازات		ڈاکٹر محمد ضیاالرحمٰن	۱۲
	شیخ سعؔدی: محمد علی فروغی کی نظر سے		سید نقی عباس کیفؔی	۱۴
	شوکت حیات: اردو افسانے کی منفرد آواز		ڈاکٹر منصور خوشتر	۱۶
	غلام مجتبیٰ انصاری: سوانح، شخصیت اور فارسی خدمات		ڈاکٹر محمد اعجاز احمد	۲۰
	میؔر کی غربت اور قنوطیت کا قضیہ		امام الدین اماؔم	۲۴
یادیں	کلام حیدری		نثار احمد صدیقی	۲۹
افسانے	برہنہ وجود		احمد صغیر	۴۰
	بوڑھا آدمی اور بوڑھا کتا		ڈاکٹر سنتوش دکشت / ظفؔر کمالی	۴۳
منظومات	تری شان جل جلالہٗ / نعت پاک		علیم صبانویدؔی / نیاؔز انصاری	۴۵
	الوداع		کائنات نورؔی	۴۶
	ایک کمرہ		ڈاکٹر کہکشاں پروین	۴۷
	غزل		وارث ریاضی	۴۸
	غزلیں		جاوید رانؔا	۴۹
	غزلیں		سلطان مظفر آزاؔد	۵۰
	غزلیں		ڈاکٹر نعیم صبؔا	۵۱
	غزلیں		رہبؔر گیاوی	۵۲
	غزلیں		میر سجاؔد	۵۳
	غزلیں		منور داناپوری / جوہیؔ عشرت	۵۴
کتابوں کی دنیا	اندر کی آگ	ظفؔر صدیقی	مبصر : ڈاکٹر عطا عابدی	۵۵
	پروفیسر طلحہ رضوی برؔق......	رضوان اللہ آروی	مبصر : ڈاکٹر طاہر الدین طاہر	۵۷
	کلیم الدین احمد	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی	مبصر : ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی	۶۱
	ناظم میواتی سہسرامی	ڈاکٹر محمد صلاح الدین	مبصر : اشفاق عادل	۶۳
وفیات	آہ! علیم صبانویدؔی		ادارہ	۶۶
سلام و پیام	ڈاکٹر نشاط اختر، محمد سعد اختر، مصطفیٰ ندیم خان غوری، ڈاکٹر قیصر زاہدی			۶۹

بچوں کا زبان وادب ۷۳ —— ۸۰

''زبان وادب''، میں شائع ہونے والی تحریروں میں ظاہر کی گئی مصنفین کی آرا سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

اداریہ

حرفِ آغاز

عیدسعید کی آمد آمد ہے اور—— بحمدہٖ تعالیٰ صدہا تہنیت کے ساتھ اسی مناسبت سے ''زبان وادب'' کے زیرنظر شمارے کی ابتدا ہو رہی ہے، جس میں ایک طرف برجستہ غزلیہ اشعار اور نظمیہ اقتباسات کا التزام رکھتے ہوئے ''اردو شاعری میں عید کا ذکر'' سعید آیا ہے اور اس حوالے سے شعرا کے فکری وتصوراتی رویے اور بیانیہ جہات کی تجزیاتی نشاندہی کی گئی ہے تو دوسری طرف منظوم تخلیقات میں پیامی اور دعائیہ رنگ وآہنگ کے ساتھ عید کے تہذیبی، ضیافتی وملبوساتی مناظر سامنے لائے گئے ہیں اور نشاط وتمنا کی عکاسی کے دوش بدوش اس حوالے سے پردیسی کے جذبات اور غریبوں کے احساسات پر بھی باتیں ہوئی ہیں اور عید کی امنگ وترنگ کے شانہ بشانہ بغض وعداوت بھولنے اور مساوات واخوت پھیلانے کی دعوت بھی دی گئی ہے۔

بعدازیں ''مقالات'' کے حصہ میں جہاں ایک طرف ضروری حوالوں سے کام لیتے ہوئے ''بیدی کے افسانوں میں فکری وفنی امتیازات'' پر گفتگو ہوئی ہے، مناسب تمہید کے ساتھ خاندانی وتہذیبی منظر وپس منظر، شخصی مزاج اور تدریسی وتصنیفی خدمات کی تفصیلیں رقم کرتے ہوئے ''غلام مجتبیٰ انصاری'' کا تذکرہ ہوا ہے اور مدلل حوالہ جاتی ومعقول تجزیاتی رمق کے ساتھ ''میرؔ کی غربت وقنوطیت کا قضیہ'' زیر بحث آیا ہے، وہیں دوسری طرف ''یوم سعدیؔ'' کے موقع پر ''شیخ سعدیؔ: محمد علی فروغی کی نظر سے'' دیکھے اور دکھائے گئے ہیں اور ماہِ وفات کی نسبت سے اہم افسانوی اور تنقیدی اقتباسات کے ساتھ ''شوکت حیات: اردو افسانے کی منفرد آواز'' کے عنوان کی صراحت کی گئی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے بعد وہ ''یادیں'' بھی ہیں جو بصورت احسن ''کلام حیدری'' کی مصروفیات، ادبی وصحافتی خدمات اور اخلاقیات کا نقشہ ہمارے سامنے رکھ دیتی ہیں۔

زیرنظر شمارے میں ''افسانے'' کے تحت جہاں دلت کہانی ''برہنہ وجود'' کی پھلوا کا کردار بیداری، انقلاب کی سوچ اور عملی جذباتی اقدامات کا اشاریہ بن کر اور بوڑھے چمار کا جواب نسل درنسل بے بسی کی زندگی کا اظہاریہ واعترافیہ بن کر سامنے آتا ہے اور ''استن کر'' کی وصولی اور اس کے طریقہ پر پنڈتوں کا اصرار ذلیل ترین استحصالی روش کا احساس دلاتا ہے، وہیں اس کہانی کے کلائمکس میں استعارے کی زبان بھی اپنی تہداری وبلاغت سے بےحد متاثر کرتی ہے، جب کہ مترجمہ کہانی ''بوڑھا آدمی اور بوڑھا کتا'' میں صاف صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ حسد اور رقابت کی نفسیات آدمی کو کس طرح بےچین رکھتی ہے اور مسلسل محرومی وطعنہ زنی اُسے کس طرح عداوت ومنافقت کی راہ پر لے آتی ہے اور آخرکار کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ مذکورہ مشمولات ہی نہیں، بلکہ اس شمارے کا منظوماتی اور تبصراتی حصہ بھی آپ کے ذوق مطالعہ کو شاکی نہیں ہونے دے گا اور ''بچوں کا زبان وادب'' بھی انہیں خوب خوب پسند آئے گا اور انہیں فائدہ بخشے گا۔

افسوس کہ گزشتہ دنوں جناب علیم صبا نویدیؔ بھی چل بسے۔ وہ ''زبان وادب'' کے دیرینہ علمی محسنین میں تھے۔ دعا ہے کہ خدائے پاک انہیں اپنے جوار رحمت میں رکھے، آمین! انہیں کلمات کے ساتھ خدا حافظ!

ابرار احمد خان

(ابرار احمد خان)

عید سعید

فرد الحسن فرد

اردو شاعری میں عید کا ذکر

اردو شاعری کا یہ وصف خاص رہا ہے کہ اس نے اپنے عہد طفلی سے لے کر عہد حاضر تک موضوعات و اسلوبیات کی سطح پر متنوع تبدیلیوں کے باوجود حیات و کائنات کے تمام تر بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے موضوعات کو نہ صرف یہ کہ اپنی گرفت میں لیا ہے، بلکہ ان کے ساتھ انتہائی سنجیدہ اور مخلصانہ سروکار بھی رکھا ہے۔

اس ضمن میں جب ہم اردو شاعری کے سماجی پس منظر یا اس کے سماجیاتی سروکار سے رابطہ قائم کرتے ہیں تو بحیثیت اردو شاعر جو نام سب سے پہلے پوری توانائی کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے، وہ نظیر اکبرآبادی کا نام ہے۔ اس کا قطعی یہ مطلب نہیں کہ ہم قلی قطب شاہ، ولی، فائز اور سراج کو نظر انداز کر رہے ہیں یا ان کی اہمیت کے منکر ہیں۔ نظیر کا وصف خاص یہ ہے کہ انہوں نے اردو شاعری کو اس اعتبار سے بہت زیادہ استحکام اور توانائی بخشی کہ اسے پوری طرح سیکولر بنا کر پیش کیا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ نظیر کے یہاں میلے ٹھیلے، پرب تیوہار، عرس اعراس، نظریے اور رویے بلاتخصیص مذہب و ملت اہم موضوعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں، جہاں عید بھی ہے اور دیوالی بھی، ہولی بھی ہے اور محرم بھی، شب برأت بھی ہے اور دسہرہ بھی، غرض کہ تہواروں کے حوالے سے قومی یکجہتی کی پوری پوری فضا بنا دی گئی ہے۔

نظیر کی شاعری سے شروع ہونے والی یہ روایت مستحکم سے مستحکم تر ہوتی نظر آتی ہے اور اسی سلسلے کی ایک کڑی اردو شاعری میں عید کے ذکر کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اردو شاعری میں عید کے ذکر سے متعلق آج کی اس گفتگو کو اگر شجاع خاور کے اس شعر کے ساتھ شروع کیا جائے تو شاید زیادہ مناسب ہوگا ؎

پیدا ہوا ہے عید کا امکان خیر سے
مولا! گزار دے مرا رمضان خیر سے

اردو شاعری، بلاشبہ، قلی قطب شاہ سے لے کر زین رامش تک اپنے تمدن کے ساتھ ساتھ چلی ہے اور تمدن کے ساتھ اردو شاعری کا اٹوٹ رشتہ ہی ہے جس نے اردو شاعری کو عید کے ذکر پر مجبور کیا ہے۔

جہاں تک عید کا تعلق ہے نظیر، میر، انیس، امیر، ذوق، آتش، چکبست، ریاض خیرآبادی، جمیل مظہری، شکیب جلالی، احمد فراز، ناوک حمزہ پوری، ظفر اقبال، پروین شاکر، شان الرحمٰن، عین تابش، کمال جعفری، احمد بدر، اثر فریدی، زین رامش اور بہت سارے دوسرے شعرا کے اشعار اس سلسلے میں ہمیں دعوت مطالعہ دیتے ہیں اور اردو شاعری میں عید کے تعلق سے اس کے کئی انداز اور کئی جہتیں ہم تلاش کر سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں شعرا کا ایک رویہ عید کے چاند کو محبوب کے رخ زیبا سے تشبیہ دینے کا رہا ہے۔ دوسرا عید کا چاند دیکھنے کے بعد حاصل ہونے والی مسرت اور انبساط کے اظہار کا رہا ہے، تیسرا سماجی نابرابری، غربت، محرومی، مایوسی اور ان سے پیدا ہونے والی صورتحال اور اس کے منفی نتائج کے ذکر کا رہا ہے۔ چوتھا مزاحیہ وطنزیہ اظہار فکر کا رویہ رہا ہے اور پانچواں نسوانی کرداروں کے ذریعہ جذبہ دل کو ظاہر کرنے کا رویہ، یہاں تک کہ اردو شاعری نے فلمی نغموں میں بھی عید کے ذکر سے گریز نہیں کیا ہے۔ ایک تابندہ مثال اس طرح ملاحظہ کی جا سکتی ہے ؎

کیسی خوشی لے کے آیا چاند، عید کا
مجھے مل گیا بہانہ تیری دید کا

عید کی خوشی کے ذکر یا اس کے اظہار کے تعلق سے متعدد مرصع اشعار آپ کو اردو شاعری میں مل جائیں گے، مثلاً ؎

نصیب جن کو ترے رخ کی دید ہوتی ہے
وہ خوش نصیب ہیں خوب ان کی عید ہوتی ہے

(امیر مینائی)

انتیسویں کو رخ کی ترے دید ہوگئی
اب چاہے چاند ہو کہ نہ ہو عید ہوگئی

(نامعلوم)

ساقی ہوں تیس دن سے میں مشتاق دید کا
دکھلا دے جامِ مے میں مجھے چاند عید کا

(آتش)

نمازِ عید ہوئی میکدے میں دھوم سے آج
ریاضؔ بادہ کشوں نے مجھے امام کیا

(ریاض خیر آبادی)

عید کا یہ چاند لایا ہے نوید خرمی
ٹال اسی کی روشنی میں گردش ایام کو

(ظفر علی خاں)

ہنگامِ عیش آیا ، وقت سعید آیا
اے دوستو مبارک! پھر روز عید آیا

وقت عیش کی دید مبارک! فرحت کی تمہید مبارک!
عشرت کی امید مبارک! عید مبارک! عید مبارک!

(عبدالواحد فاضلؔ)

آرزوئے دید جاناں کیوں نہ ٹھہرے جانِ عید
ہے یہی تو عاشقوں کی عید اور سامانِ عید
آج ہو ان کا کرم بانہیں گلے میں ڈال دیں
عید کے دن تو نکل جائے میرا ارمان عید

(رضاؔ الہ آبادی)

عید میں ذوق دید ملتا ہے
کیا ہی لطف مزید ملتا ہے

(نامعلوم)

اساتذہ کے ان اشعار میں عید کے تعلق سے جذب وکیف کی جو فضا ملتی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کی بدولت اردو شاعری کی روایتی لذت کاری سے بھی ہم آشنا ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ جذب وکیف بہت بعد کے شعرا بلکہ جدید شعرا کے یہاں بھی ملتا ہے اور یہ موضوعات ہمیں بہت واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں جدید لب و لہجے کی اہم ترین شاعرہ پروینؔ شاکر کا یہ شعر دیکھیں ؎

گئے برس کی عید کا دن کیسا اچھا تھا
چاند کو دیکھ کے اس کا چہرہ دیکھا تھا

پروینؔ شاکر کے اس شعر میں درد کی لذت کا جو بیان ہے اور ایک خاص کیفیت کا جس طرح اظہار کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اور دل پذیری سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور اس طرح کے اشعار ایک خاص کیفیت، مسرت، انبساط، لطافت، صباحت اور محبت کی فضا میں سانس لیتے نظر آتے ہیں۔ گویا کیفیت قلب و ذہن کا نرم و نازک اظہار کرنے والے یہ اشعار اپنی مثال آپ قرار پاتے ہیں۔

اس کیفیت سے الگ ایک دوسری کیفیت محرومی، مایوسی، ہجر اور تنہائی کا اظہار بن کر سامنے آتی ہے، یہ اشعار دیکھیں ؎

مجھے تیری، نہ تجھے میری خبر جائے گی
عید اب کے بھی دبے پاؤں گزر جائے گی
گلیوں، بازاروں میں در آئیں گے کھلتے چہرے
پر مرے دل کی کلی درد سے بھر جائے گی

(شکیبؔ جلالی)

جہاں نہ اپنے حبیبوں کی دید ہوتی ہے
کہیں غریب وطن کی بھی عید ہوتی ہے

(عین تابشؔ)

پیٹ پر باندھ لو اگر پتھر
ایک مفلس کی عید ہو جائے

(شائقؔ مظفر پوری)

صحن گلشن میں گلوں کی دید کیا
ہم مسافر ہیں ہماری عید کیا

(حیرتؔ)

سحر گہ عید میں دورِ سبو تھا
پر اپنے جام میں تجھ بن لہو تھا

(میرؔ)

جوہؔر نوری
Moh. Chaudhriyana Ara, C.K.Road, Ara - 802301

عید

مژدۂ جاں فزا اب سنا دے
نور سے دل مرا جگمگا دے
آج جشن مسرت کا دن ہے
آج اخلاق و ملت کا دن ہے
دوستوں کی ضیافت کا دن ہے
دل سے سب کے کدورت مٹا دے
نور سے دل مرا جگمگا دے
آج ملنے ملانے کا دن ہے
دل سے نفرت مٹانے کا دن ہے
رسم الفت بڑھانے کا دن ہے
دل میں الفت کی دیپک جلا دے
نور سے دل مرا جگمگا دے

❀❀❀

ابونصر فاروق صارؔم
Khajur Banna, Pathar ki Masjid, Patna - 800006
(Mob. 8298104514)

عید کا چاند

عید کا چاند ہمارے لئے خوشیاں لایا
منتظر جس کے تھے وہ عیش کے ساماں لایا
عید ہاتھوں میں لئے آئی سویاں پیارے
ایسا لگتا ہے کہ ہیں زلف نگاراں پیارے
اپنے دامن میں لئے فصل بہاراں پیارے
رسم الفت ہے کہ ہم آج گلے مل جائیں
ایک جاں اور دو قالب ہیں بہم کہلائیں
زخم جیسا بھی ہو ، جو بھی ہو اسے سہلائیں
آج سب اپنے ہیں کوئی بھی یہاں غیر نہیں
دل محبت کا سمندر ہے جہاں بیر نہیں
قید شیطان ہے اُس کے لئے اب سیر نہیں

❀❀❀

بے یار ، روزعید شب غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پر نم سے کم نہیں
(ذوقؔ)

ایک محرومِ دید تیرا رضاؔ
ایک جو تجھ سے عید ملتا ہے

محرومِ دید یار بھلا کیا منائے عید
اس کے لیے تو ایک ہے آئے نہ آئے عید
(رضاؔ الٰہ آبادی)

کیا ہو سرورِ عید سفر میں غریب کو
بے کس تڑپ رہا ہے وصال حبیب کو
(عشرتؔ)

سفر میں، بے کسی میں، فرقت جاناں میں، عید آئی
غم نو، حسرتِ تازہ کی جاں کو اک وعید آئی
(نامعلوم)

عید کے دن بھی گلے ملنے کی حسرت رہ گئی
آج بھی دل ہی میں میرے دل کی حسرت رہ گئی
(احسنؔ)

عبدالرزاق رضویؔ

سرد آہوں میں بھی آجائے حرارت عید کی

رسم الفت سے بغاوت صبح عشرت عیدکی
اس مبارک دن بھی بھولے تم ضیافت عید کی

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کرامت عید کی
آئے دشمن بھی گلے ملنے بدولت عید کی

کہہ رہی تھی رو کے اک عورت حکایت عید کی
مفلسی نے چھین لی ساری مسرت عید کی

ظلمت شب سے تو نبٹیں پہلے مشتاقِ سحر
غم سے گزریں گے کھلے گی تب حقیقت عید کی

غور سے سوچے کوئی تو ہے بلاشک قیمتی
سینکڑوں لمحوں سے غم کے، ایک ساعت عید کی

کیوں بھلا مارا پھروں جھوٹی مسرت کے لئے
گھر میں جب موجود ہو پاکیزہ صورت عید کی

مرد و زن، نو عمر بچے، ہوں جواں یا ہوں ضعیف
جھانکتی ہے سب کی آنکھوں سے مسرت عید کی

موتیا، جوہی، چنبیلی، خس، حنا، عطر گلاب
ہے ہواؤں کے سبک آنچل میں نکہت عید کی

لال، پیلے، سبز، نیلے، سرمئی زریں لباس
شوخ جلوؤں نے بڑھائی شان وشوکت عید کی

اس بہانے ہی سہی موقع بھی ہے، دستور بھی
میرے گھر تم آؤ یا دو مجھ کو دعوت عید کی

تیری پیاری باتیں لچھے اور لب شیریں ہے قند
تو جو آجائے تو بڑھ جائے حلاوت عید کی

غم سے کب تک غمزدہ دل کو یونہی بہلائیں گے
ان کے گھر کب آئے گی یا رب مسرت عید کی

یا خدا تو قادر مطلق ہے یہ صورت نکال
سرد آہوں میں بھی آجائے حرارت عید کی

❁❁❁

ہجر کی شام ڈھلے صبح کی امید بھی ہو
کوئی صورت تو ہو ایسی کہ تری دید بھی ہو
عید لوگوں نے منا لی ہے بس اک مرے سوا
اے مرے چاند نظر آ کہ مری عید بھی ہو

(فردالحسن فردؔ)

عید کے ذکر سے متعلق مذکورہ اشعار، بلاشبہ، قلب و ذہن کو ایک خاص کیفیت سے سرشار کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں اور وہ شاید اس لیے کہ شاعری کو ذکر تعب سے ہی توانائی حاصل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک بالکل الگ کیفیت بھی ملاحظہ کی جاسکتی ہے، یہ کیفیت جہاں ایک طرف اکبرالہ آبادی کہ ان اشعار میں یوں ملتی ہے ۔

سنا بدایوں میں اب کے ہوئی نرالی عید
وہاں تو اب کے اٹھائیس کی منالی عید
جو ہر برس یونہی گھٹتا رہے گا اک اک دن
تو بست وہشت برس بعد ہوگی خالی عید

وہیں دوسری طرف ناوکؔ حمزہ پوری کے یہ اشعار بھی دیکھئے کہ کتنے مزے دیتے ہیں۔

مظہرؔ زاہدی

Loharwa Ghat Lane, Alamganj, Patna - 800007 (Mob. 9934410620)

ھلالِ عید

عید کا چاند نکلا مسرت لئے
اپنے ہونٹوں پہ پیغامِ عشرت لئے

بچے بوڑھے جواں ہیں خوشی میں مگن
سب کے گھر بن گئے ہیں مثالِ چمن

سب کے دل میں امنگیں جگاتی ہے عید
ساتھ میں اپنے خوشیاں بھی لاتی ہے عید

نعمت نو بہ نو سے ہیں ٹیبل سجے
دودھ لچھوں سے ہیں سب کٹورے بھرے

خوشبوؤں میں بسے تن کے پوشاک ہیں
کلمۂ شکر سے سب کے دل پاک ہیں

دشمنوں کو گلے سے گلے ہم لگائیں
بغض و کینہ کے جذبے سبھی بھول جائیں

عید آئی ہے ، لیکن وطن دور ہے
ہر مسرت مرے دل کی کافور ہے

بال بچوں کی یادوں کا طوفان ہے
ان سے ملنے کا ہر سانس ارمان ہے

عید کی عشرتیں ہیں اُسی کے لئے
جس نے رمضاں کے روزے خوشی سے رکھے

آؤ مظہرؔ یہ مل کر دعا ہم کریں
اب نہ اپنوں سے بچھڑیں وطن میں رہیں

❁❁❁

دیکھتا آیا ہوں برسوں سے عجب یہ ماجرا
چاندروزے کا ہوا جب بھی، ہوا ہے تیس کا
ابر آلودہ بھی ہو مطلع، مگر از بہر عید
ریڈیو پر ڈھونڈ ہی لیتے ہیں چاند انتیس کا

اورپھر ناظم انصاری کا یہ رنگ دیکھئے ۔

ہر روز، روزِ عید ہے بیگم کے واسطے
ہرشب،شب برات ارے باپ! کیا کریں!

یامنوّر رانا کا یہ شعر ۔

عید میں یوں توکئی روز ہیں باقی لیکن
تم اگر چھت پہ چلے جاؤ غضب ہوجائے

یا بین بین کی ایک بالکل مختلف صورتحال جو یوں سامنے آتی ہے کہ ۔

شہر میں عید کا میلا دیکھا — خاصہ ریلا پیلا دیکھا
جو دیکھا البیلا دیکھا — گھر گھر ایک جھمیلا دیکھا
عید منانے والے نکلے — خوش خوش جانے والے نکلے
دینے دلانے والے نکلے — مانگنے کھانے والے نکلے
آج مزے ہر آن نئے ہیں — عہد نئے ، پیمان نئے ہیں
شوق نئے ، ارمان نئے ہیں — عید نئی ، سامان نئے ہیں
یہ لذت بھی فانی نکلی — تھی جو نئی وہ پرانی نکلی
یہ بھی فقط کہانی نکلی — عید بھی آنی جانی نکلی

مندرجہ بالا اشعار میں چندکوچھوڑ کر بیشتر اشعار غزلوں سے پیش کیے گئے

ہیں۔غزل کی لخت لخت کیفیت سے الگ نظموں کے حوالے سے بلا تامل یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نظموں میں جامع اظہار کے بہرحال زیادہ مواقع حاصل ہوتے ہیں، اگر چہ خصوصی طور پر نظمیہ شاعری کے ایک بڑے ذخیرے کا ذکر اس سلسلے میں کیا جاسکتا ہے، تاہم عید کے ذکر کے تعلق سے نظیرؔ اکبرآبادی، علامہ جمیلؔ مظہری، کمالؔ جعفری اور زین رامشؔ وغیرہ کی نظموں کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے میں جہاں ایک طرف نظیرؔ اکبرآبادی اور کمالؔ جعفری کی نظم عید کا منظر نامہ پیش کرتی ہے، وہیں دوسری طرف علامہ جمیلؔ مظہری اور زین رامشؔ کی نظمیں سماجی نابرابری کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں اور ایک سوالیہ نشان چھوڑ جاتی ہیں۔نظیرؔ کی نظم میں نہ صرف یہ کہ عید کی خوشیوں کا ذکر ہے بلکہ عید کی تیاریوں کو بھی بڑے پُر اثر انداز میں الفاظ کا جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی ہے۔نظیرؔ کی نظم عید کے صرف تین بند دیکھیں ۔

ہے عابدوں کو طاعت وتجرید کی خوشی
اور زاہدوں کو زُہد کی تمہید کی خوشی
رند عاشقوں کو ہے نئی امید کی خوشی
کچھ دلبروں کے وصل کی، کچھ دید کی خوشی
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے عید کی خوشی

اور پھر اس منظر کو محسوس کیجیے ۔

پچھلے پہر سے اٹھ کے نہانے کی دھوم ہے
شیر وشکر سیویاں پکانے کی دھوم ہے
پیر و جواں کو نعمتیں کھانے کی دھوم ہے
لڑکوں کو عید گاہ کے جانے کی دھوم ہے
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے عید کی خوشی

عید کی مبارکباد کا یہ منظر بھی دیکھیں ۔

محبوب دلبروں سے ہے جن کی لگی لگن
ان کے گلے سے آن لگا ہے جو گلبدن
سوسو طرح کے چاؤ سے مل مل کے تن سے تن
کہتے ہیں تم کو عید مبارک ہو جانِ من
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک دل میں ہے عید کی خوشی

عید کی یہ خوشی کمالؔ جعفری کے یہاں محبت واخوت اور رواداری کے حسین تناظر میں جلوہ گر ہوتی ہے۔کمالؔ جعفری نہ صرف خلق واخلاص و اخوت کی بات کرتے ہیں بلکہ محبت کی فضا قائم کرنے اور نفرت کی گھٹا کو ختم کرنے کا پیغام بھی دیتے ہیں۔ان کی طویل مرصع نظم ''عید'' کے یہ چند اشعار بھی قابل مطالعہ ہیں ۔

آج ہر شخص کے لب پر ہے تبسم کی کرن
جس طرف دیکھو محبت کی ہیں شمعیں روشن
خلق و اخلاص و محبت کا نیا جام لیے
عید آئی ہے اخوت بھرا پیغام لیے
ہم جہاں بھی رہیں، پھیلائیں محبت کی فضا
ختم ہوجائے ہمیں دیکھ کے نفرت کی گھٹا
خدمت خلق سے معمور جہاں ہوجائے
عید کی عظمت و برکت بھی عیاں ہوجائے

عید کا یہ منظر نامہ علامہ جمیلؔ مظہری کے یہاں اس طرح بدلتا ہے، جو صرف محسوس کرنے سے تعلق رکھتا ہے اور شاید یہ بات بھی کہی جاسکتی ہے کہ عید کے تعلق سے علامہ جمیلؔ مظہری کی نظم ''غریبوں کی عید'' کو جو اہمیت اور وقار حاصل ہے وہ اس طرح کی کسی دوسری تخلیق کو نصیب نہیں۔علامہ جمیلؔ مظہری عید کی خوشیوں پر نظر تو رکھتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ساتھ ان غریبوں کی بے بسی پر بھی ان کی نگاہ ہوتی ہے جن کے یہاں عید کا تصور ہی کشمکش حیات کا باعث بنتا نظر آتا ہے۔جمیلؔ مظہری کی نظم ہوا کے نرم رفتار جھونکے کی صباحت کے انداز میں شروع ہوتی ہے اور پھر اپنی کیفیت جمال سے گزرتے ہوئے کیفیت جلال تک پہنچتی ہے۔ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیں ۔

ہلال عید ہے صبح نشاط کا پیغام
بنی ہے طالع روشن جبین لیلائے شام

ہلالِ عید کو ابروئے یار کیوں کہیے
جو کہہ چکے ہیں اسے بار بار کیوں کہیے
تبسم لب رنگین سیم بر کہیے
کسی حسیں کی چرائی ہوئی نظر کہیے

بقولِ نور جہاں ماہِ نو ہویدا شد
کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

نظم کے دوسرے حصے میں جمیلؔ اس غریب کی کیفیت کا منظر پیش کرتے ہیں جسے عید کی نماز پڑھنے جانا ہے۔ وہ اپنے پرانے کرتے کو رفو کرنا چاہتا ہے، لیکن وہ اس قدر پرانا اور بوسیدہ ہو چکا ہے کہ سوئی کی چبھن بھی برداشت نہیں کر پاتا۔ نظم کا یہ حصہ ملاحظہ ہو ؎

طرب فروز ہوا بسکہ شادیانۂ عید
دلوں کے ساز پہ چھڑنے لگا ترانۂ عید
خوشی کی دھوم مسرت کی گرم بازاری
سکوتِ شام پر اک کیفیت سی ہے طاری
طرب کدوں میں ہے ملت کی عید کی تقریب
اور اپنے کلبہ احزاں میں ایک مردِ غریب
حصیر فقر پہ بیٹھا ہے ، شمع ہے روشن
قبائے کہنہ ہے زانو پہ ہاتھ میں سوزن
خیال یہ ہے کہ کل عیدگاہ جانا ہے
جو ملنے والے ہیں ان سے نظر ملانا ہے
نظر ہے چاک پہ اور آہ سرد بھرتا ہے
غیور دل نگہ عیب جو سے ڈرتا ہے
ہنسی قبا کو بھی اس سادگی پہ آتی ہے
وہ اور کاوشِ سوزن سے مسکی جاتی ہے
غرض کہ پیرہن خستہ ہوسکا نہ رفو
جگر سے ہوک اٹھی ، پی کے رہ گیا آنسو
اٹھا کے رکھ دیا اس خرقۂ گدائی کو
فریب دے نہ سکا ذوقِ خود نمائی کو

اور پھر علامہ جمیلؔ مظہری کی اس نظم میں عید کے تعلق سے دوسرا نہایت پر اثر منظر یوں پیش ہوتا ہے کہ ؎

سحر ہے عید کی اور ایک غریب کا لڑکا
کھڑا ہے راہ میں پہنے گزی کا اک کرتا
گزر رہا ہے ادھر سے اک اور طفل حسیں
لباس جس کا ہے پر زر، کلاہ ہے زریں
نظر کی طرح سے مڑتا اِدھر اُدھر وہ شریر
غرور آنکھ میں لب پر تبسم تحقیر

اشعار عید

ہے عید کا دن آج تو لگ جاؤ گلے — جاتے ہو کہاں جان مری آ کے مقابل (مصحفیؔ)
خوش پھر رہی ہے خلق خدا صبح عید ہے — ہر سمت زیب و زینت دُنیا کی دید ہے
پیش نظر مرے ہے شامِ شب فراق — اِس کی سحر جو ہو تو ہماری بھی عید ہے (اکبرؔ)
حاصل جو نشاط دید ہوتی ہے — سر مست ہر اک اُمید ہوتی ہے
عید رسمی کا میں نہیں قائل — جب ملتے ہیں آپ عید ہوتی ہے (سیمابؔ)
عید کا دن ہے گلے آج تو مل لے ظالم — رسم دُنیا بھی ہے، موقع بھی ہے، دستور بھی ہے (قمر بدایونی)
دیکھا جو میں نے چرخ پر روشن ہلالِ عید — راحت فزا ہوا مجھے از بس خیالِ عید
آیا ہے آسماں سے سب کو پیامِ عید — اے دوستو لیجئے میرا سلامِ عید
ہوتا ہے جس میں رحمت حق کا نزول — فضل خدا سے عید وہ روزِ سعید ہے (نامعلوم)

نگاہِ یاس سے طفل غریب نے دیکھا
وہ اک نگاہ جو تھی حسرتوں کی اک دنیا
وہ اک نظر کہ جو تھی شکوہ سنج ذوقِ نگاہ
وہ اک نظر جسے کہیے بجائے خود اک آہ
وہ اک نظر کہ جو تھی سرنگوں خجالت سے
وہ اک نظر کہ جو تھی اک سوال فطرت سے
وہ اک نظر کہ جو تھی سوگوارِ منظر عید
وہ اک نظر جو تمدن پہ کرگئی تنقید

علامہ جمیلؔ مظہری کی یہ نظم ۱۹۳۴ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے پچاس سال بعد زین رامشؔ نے اپنے عہد کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ اور بھی سوہان روح ہے اور حقیقت سے قریب بھی۔ اچھی شاعری بلاشبہ وہ شاعری ہوتی ہے جو بہت دیر تک اور بہت دور تک اپنی معنویت قائم رکھنے میں کامیاب وکامراں ہوتی ہے۔ ''سوالیہ نشان'' کے عنوان سے شائع شدہ زین رامشؔ کی اس نظم کی معنویت یہ بھی ہے کہ یہ زلزلہ کی صورتحال کی عکاسی بھی کرتی نظر آتی ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ ہوں:

جو عید آئی
ہزار آنسو، ہزار آہیں وہ ساتھ لائی
کہیں پہ ماؤں کی سسکیاں ہیں
کہیں پہ بچے بلک رہے ہیں
وہ بیٹیاں مادر وطن کی
جو بیوگی کا کفن پہن کر
ہر اک تمنا کو دفن کر کے گزارتی ہیں
ہے کون جو اُن کے اشک پونچھے
ہے کون جو
پر شباب سانسوں کا بوجھ اٹھائے
ہے کون جو اُن کا ہاتھ تھامے
اُداس آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی نمی سی
یہ خشک ہونٹوں کی پیاس
ویران زندگی سی
ہر ایک لمحہ اُداس بوجھل
ہر اک لمحہ حواس بوجھل
یہ عید ہے؟
یا اجاڑ لمحوں کا مرثیہ ہے

ابتدا میں ہی عرض کیا گیا کہ اردو شاعری میں عید کا ذکر مختلف انداز اور مختلف طرز اظہار کے حوالے سے کیا جاتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ ابتدا سے لے کر عہد حاضر تک پھیلا ہوا ہے اور جذبات و احساسات کی مختلف کیفیات کو متنوع اور منفرد انداز میں پیش کرنے کی سعی، کمال ہنرمندی کے ساتھ کی گئی ہے۔ ❁❁

اشعار عید

مقبول ہو الٰہی دعا یہ حجابؔ کی — اسلام میں رہے یوں ہی لیل و نہار عید (حجابؔ)

منائی عید تم نے بال بچوں کی ، ندیموں کی — مگر فریاد بھی کچھ کان میں آئی یتیموں کی؟
مسلماں تمہیں احکام کی کچھ یاد بھی آئی — تمہارے کان میں معصوم کی فریاد بھی آئی؟ (راشدالخیری)

گلے اک دوسرے سے مل رہے ہیں صاحب ایماں — لباسِ عید میں رحمت پروردگار آئی ہے
منتظر سارا عالم تھا جس کی دید کا — چاند وہ نکلا ہے دیکھو عید کا (نامعلوم)

درس انسانیت جس سے ملتا ہے شوقؔ — عید رمضاں ہے امن و اماں کا نشاں (شوقؔ حیدرآبادی)

کل اگر عید کا دن ہوگا تو کیا پہنیں گے — چاند سے کہنا کہ تیار نہیں ہیں ہم لوگ (معراجؔ)

نکلا نہیں ہے چاند فلک پہ یہ عید کا — موقع ملا ہے آج مجھے تیری دید کا
عید کے دن شکوۂ جور و جفا جاتا رہا — تم گلے سے مل گئے سارا گلہ جاتا رہا (نامعلوم)

مقالات

ڈاکٹر محمد ضیاالرحمٰن

Retd. Associate Prof. Deptt. of Urdu, S. Sinha College, Aurangabad-824101

(Bihar) (Mob.8083024500)

بیدی کے افسانوں میں فکری وفنی امتیازات

جدید افسانہ نگاری کا آغاز ترقی پسند تحریک کے بعد ہوتا ہے، جب کہ موضوع اورفن دونوں اعتبار سے اردو زبان کے سرمایے میں اعلیٰ درجے کے افسانہ نگاروں کا اضافہ ہوا۔ ایسے افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، منٹو، احمد ندیم قاسمی اور خاص طور سے راجندر سنگھ بیدی کا نام قابل التفات اور قابل ذکر ہے۔

بیدی کو جدید افسانوی ادب میں کرداری افسانوں کا نمائندہ کہا جاتا ہے۔ ان کے کردار کسی نہ کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہوتے ہیں جن کا سراغ ان کے شعور اور تحت الشعور میں ملتا ہے۔ کرداروں کی یہ نفسیات، چیخوف کے افسانوں کی یاد دلاتی ہے۔ ان کا کردار جیتا جاگتا انسان ہے جو زندگی کی متحرک تصویر پیش کرتا ہے۔ بیدی نے تقسیم ہند کے المناک پس منظر میں ایک بے مثال افسانہ ''لاجونتی'' لکھا جس میں تخلیق کار کے بےلوث نفسیاتی طرز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان افسانوں میں فکر وفن کا حسین امتزاج ہے اور اس کے علاوہ ان کی تعمیر وتشکیل اور ان کے بیانیہ اسلوب میں اعلیٰ فنی مہارت کا ثبوت دیا گیا ہے، اس لئے انہیں بلاشبہ اردو میں ادب عالیہ کا درجہ حاصل ہے۔

بیدی نے ۱۹۳۲ء میں لکھنا شروع کیا اور ان کا پہلا مجموعہ ''دانہ ودام'' شائع ہوتے ہی ان کو صف اول کا فن کار تسلیم کرلیا گیا۔ بیدی کے متعدد افسانوی مجموعوں کے علاوہ ڈراموں کا مجموعہ اور ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' بھی ان کی قیمتی یادگار ہے۔

وقت کے ساتھ بیدی کے فن اور اسلوب کا ارتقا بتدریج ہوتا رہا۔ پریم چند کی حقیقت نگاری کی روایت کو آگے بڑھانے میں انہوں نے نمایاں حصہ لیا۔ بیدی نظریاتی طور سے گرچہ ترقی پسند تحریک سے قریب رہے، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ترقی پسند تحریک کی صرف انسان دوستی اور سماجی حقیقت نگاری سے متاثر ہوئے، مگر اس کی نعرہ بازی اور اس کی انتہاپسندی سے پوری طرح اپنا دامن بچائے رکھا۔

بیدی نے پنجاب کے دیہاتوں کی زندگی اور یہاں کے سماجی وتہذیبی پس منظر کو اپنی تخلیق کا مرکز ومحور بنایا۔ اس کے علاوہ ان کے افسانوں میں سماجی ومعاشی بدحالی کی دردناک تصویر بھی نظر آتی ہے جس کا مشاہدہ ''لاجونتی''، ''وٹامن بی''، ''صرف ایک سگریٹ''، ''گرہن''، ''کوکھ جلی''، جیسی تخلیقات میں کیا جاسکتا ہے۔ ان افسانوں میں سماج میں ہونے والے ظلم، جبر، ناانصافی کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بیدی حقیقت اور تخیل کی بنیاد پر اپنے افسانے کی عمارت تعمیر کرتے ہیں، لہٰذا ان کے افسانے حقیقی ہوتے بھی جذبے اور فکر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس طرح تخلیقی عمل کے اس ہنر سے ان کے فن پاروں میں فنی حسن پیدا ہوجاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''لکھنے سے پہلے میرے ذہن میں نفس مضمون کا محض ظاہری پہلو ہوتا ہے۔ یہاں تک تو مشاہدے کا تعلق تھا۔ اس کے بعد میرے تخیل نے طنز کی صورت میں ایک باطنی پہلو تلاش کرلیا۔ ذہن اور تحریر آپس میں یوں گھل مل گئی کہ مجموعی طور پر ایک تاثیر کی صورت اختیار کرلی۔''

مندرجہ بالا اقتباس سے بیدی کی فنی خصوصیات اور اس کے رموز نکات کی نشاندہی ہوتی ہے۔ بیدی چند لفظوں میں اپنے وسیع تجربات پیش کر دیتے ہیں اور باقی حصے کو خیال کے پردے میں پوشیدہ رکھتے ہیں، اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

> ''بیدی کے افسانوں میں تھوڑی دیر میں بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے، لیکن اس سے زیادہ خیال کے لئے چھوڑ دیا

جاتا ہے۔نزاکت،نفاست،دردمندی ایک خاموش حزن
بیدی کی خصوصیات ہیں اوران کی ابدیت کی ضمانت۔''

وہ بہت سے خیال کو پوشیدہ کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے افسانوں میں بہت کچھ ایسا ہے جو انہوں نے کہہ دیا اور جو نہیں کہا وہ خود بخود قاری اپنی زندگی سے ڈھونڈ لے گا۔ دراصل یہ کہانیاں اصل زندگی سے کافی قریب ہیں۔انہوں نے زندگی کے نشیب و فراز، دکھ سکھ اور دوسرے مسائل کو بڑے آزادانہ انداز میں دیکھا ہے، چنانچہ اس حقیقت کو وہ افسانہ''باری کا بخار''میں کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''سامنے چور رستے پہ رکشا والے، رکشا بازوں پر گھنٹیاں مارتے ہوئے گزر رہے تھے۔کام کرنے والوں، مزدوروں کی شکل دنیا میں ہر جگہ ایک سی ہوتی ہے، اس لئے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ لوگ گول گول بھوگول چکر کاٹ کر پھر وہیں آنکلے ہیں۔ایسے ہی ٹھیلے اور گاڑیوں والے...... انہیں لو سے بھی بری کوئی آگ لگی تھی، ورنہ گھر کا سکھ اور آرام چھوڑ کر یہ لوگ دوپہر کے وقت سڑکوں پر نکل آتے؟''

ان سطروں میں وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، اُسے پوری طرح وہی سمجھ سکتا ہے جو خود بھی کبھی اس آگ کی تپش سے واقف ہوا ہو، صدیاں گزر جانے کے باوجود آج بھی ہمارے اردگرد یہ متوسط طبقہ یوں ہی آگ میں تپتا اپنی گاڑی کھینچ رہا ہے۔ اس تلخ حقیقت کو راجندر سنگھ بیدی جیسا حساس فن کار ہی محسوس کرسکتا ہے۔

بیدی کے افسانوں کے پس منظر میں زیادہ تر عام لوگ اور خاص طور سے متوسط طبقہ نظر آتا ہے اور اس طبقے کے سماجی تناظر میں عام گھریلو زندگی، یہاں کی الجھنوں پریشانیوں، آرزوؤں اور ارمانوں کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دیتی ہے۔اس کے ساتھ ہندوستان اور یہاں کی تہذیبی قدروں اور زندگی کی بنیادی سچائی کا مشاہدہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اسلوب احمد انصاری بیدی کی اس فکری جہت کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ان کی کہانیوں میں اس ہندوستان کی تصویر جھلکتی ہے جو کروڑوں جاہل غریب اور توہم پرست انسانوں کا ملک ہے، مگر جن میں تمام کمزوریوں اور موانعات کے باوجود ایک توانائی، ایک کس بل، زندگی کی بنیادی سچائی میں یقین اور تہذیبی قدروں کا عکس ملتا ہے۔''

جہاں تک علامتی طرز تحریر کا تعلق ہے اسے کبھی کبھار ترقی پسندوں کے دور میں بھی استعمال کیا گیا ہے اور اسے راجندر سنگھ بیدی نے خاص طور سے اپنے افسانے''رحمان کے جوتے''،''اغوا''،''اپنے دکھ مجھے دے دو'' وغیرہ میں پیش کیا ہے۔ دراصل ان کے افسانوں میں اشاروں اور علامتوں کا استعمال مقصد کو زیادہ مؤثر بنانے کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے جس سے ان کے فنی حسن میں دلکشی پیدا ہوجاتی ہے۔

تقسیم ملک پر برپا ہوئے فسادات، معصوم عورتوں کا اغوا اور ان کی باز آبادکاری کے مسئلے پر اردو میں کافی افسانے لکھے گئے۔ اس سلسلے میں بیدی نے''لاجونتی'' لکھا جو کہ فسادات پر تحریر کی گئی کہانیوں میں علامتی اعتبار سے ایک اہم کہانی ہے۔ بیدی نے رائج الوقت فنی اسلوب کو وقت کے تقاضوں کے تحت ڈھالا، جس کی بنا پر علامتی کہانیوں اور تجریدیت کے رجحان نے تقویت حاصل کی۔ انہوں نے ٹوٹتے ہوئے رشتوں اور منہدم ہوتی ہوئی قدروں کو موضوع بناتے ہوئے زندگی کو اس کے حسن وقبح کے ساتھ پیش کیا۔

اس طرح ان کی کہانیوں میں مختصر کہانی کا جو تصور ملتا ہے، وہ وہی ہے جو عالمی سطح کے افسانہ نگاروں کے یہاں نظر آتا ہے اور اس طرز فکر سے بیدی کے افسانوی کرداروں میں توانائی، معنویت اور انفرادیت کا احساس ہوتا ہے۔ اسطور سازی اور جنس کو اگرچہ بیدی کافی اہمیت دیتے ہیں، لیکن بنیادی طور پر وہ زندگی کے وژن کو تخلیقی عمل کے لئے لازمی سمجھتے ہیں۔ جہاں تک فن میں حقیقت نگاری کا تعلق ہے تو وہ معروضی حقیقت سے انحراف کرتے ہوئے انتقادی حقیقت کو اہمیت دیتے ہیں، اس لئے ان کے فن پاروں میں زندگی کی گرمی اور تجربات کی تمازت کو شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ مواد اور فن دونوں اعتبار سے بلا شبہ راجندر سنگھ بیدی اردو کے بلند قامت فن کار ہیں اور ان کے فن کا دائرہ صرف فکشن تک محدود نہیں بلکہ اسکرپٹ نویسی اور فلمی مکالمہ نگاری تک پھیلا ہوا ہے۔

۞۞۞

سید نقی عباس کیفی
Head, Deptt, of Persian, L.S. College, B.R. Ambedkar Bihar University
Muzaffarpur - 842001 (Mob. 8860793679)

شیخ سعدی: محمد علی فروغی کی نظر سے

یکم اردی بہشت/۲۰، اپریل ''یوم سعدی'' کے طور پر منایا جاتا ہے، چنانچہ اس مناسبت سے آج اس مختصر سی تحریر کا مقصد اُس آفاقی شاعر کو یاد کرنا ہے جو ''بنی آدم'' کو ''اعضائے بدن'' تصور کرتا تھا اور کہتا تھا کہ جس طرح اعضائے بدن ایک دوسرے سے مربوط ہیں اُسی طرح بنی آدم بھی آدم کی اولاد ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، ایک بدن یعنی ''انسانیت'' کے حصے ہیں، جس طرح اگر بدن کے کسی حصے کو کوئی تکلیف ہو تو پورا جسم اُس درد کو محسوس کرتا ہے، اسی طرح ہمیں انسان ہونے کے ناطے ایک دوسرے کے دکھ درد کو محسوس کرنا چاہئے اور اگر ہم ایک دوسرے کی تکلیف کو محسوس نہیں کر سکتے تو ہم انسان کہلانے کے لائق نہیں۔ انسانیت کا تقاضا یہی ہے کہ دنیا کے تمام انسان، بلا تفریق مذہب و ملت، انسانیت کے علمبردار بنیں اور ایک دوسرے کی دستگیری میں پیش قدمی سے کام لیں۔

سابق ایرانی وزیر اعظم محمد علی فروغی (م:۱۹۴۲ء) ایک ادیب اور محقق کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اپنی مخصوص شناخت رکھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف فارسی متون بالخصوص ''کلیات سعدی'' کی تدوین میں جس دقت نظر سے کام لیا ہے اس کے باعث ادبی دنیا ان کی قدر کرتی ہے۔ ''غزلیات سعدی'' کے ابتدائیہ میں جو باتیں انہوں نے شیخ سعدی کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق کہی ہیں، انہیں یہاں پیش کیا جا رہا ہے تاکہ شیخ سعدی کی عظمت کا راز آشکار ہو سکے اور ''یوم سعدی'' پر انہیں خراج عقیدت پیش کیا جا سکے۔

شیخ سعدی نہ صرف ایران کے ایک بلند مرتبہ شاعر ہیں بلکہ دنیا کے عظیم ترین شاعروں میں بھی منفرد ہیں۔ فارسی ادب میں ایک یا دو شخصیت ہی ایسی ہوگی جن کا موازنہ سعدی سے کیا جا سکتا ہے اور قدیم و جدید دنیا کے دیگر شعرا میں بھی بہت کم ایسے ہیں جو سعدی کی برابری کر سکیں۔ ایران میں وہ اپنی شہرت اور مقبولیت کے لحاظ سے بے مثال ہیں اور خاص و عام کو ان کے اشعار ازبر ہیں۔ ایران سے باہر بھی عوام و خواص بہر حال ان کی عظمت سے واقف ہیں۔ البتہ ان کی زندگی کے حالات اور تفصیلات سے متعلق زیادہ معلومات دستیاب نہیں ہیں۔

تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شیخ سعدی کا تعلق ایک مذہبی خاندان سے تھا۔ وہ ساتویں صدی ہجری کے اوائل میں شیراز میں پیدا ہوئے۔ جوانی میں بغداد گئے اور وہاں مدرسہ نظامیہ اور دیگر علمی مراکز میں اپنی دینی اور ادبی تعلیم کی تکمیل کی۔ بعد ازاں، عراق، شام اور حجاز کا سفر کیا اور حج ادا کیا اور ساتویں صدی ہجری کے اواسط میں جب فارس میں ابوبکر بن سعد بن زنگی حکمرانی کر رہے تھے تو حضرت سعدی، شیراز واپس آئے۔ ۶۵۵ ہجری میں انہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''بوستاں'' اور اس کے اگلے سال (یعنی ۶۵۶ھ میں) ''گلستاں'' تصنیف فرمائی۔ اتابک ابوبکر کے بیٹے کا نام ''سعد'' تھا، چنانچہ نسبت کو شیخ نے اپنا تخلص قرار دیا اور ہمیشہ اپنے قلم اور زبان سے اہل طلب کو فیضیاب اور اہل ذوق کو محظوظ اور متمتع کرتے رہے۔ کبھی کبھار قصیدہ اور غزل میں فارس کے بزرگوں، سلاطین، وزرا اور امرا کو پند و نصائح بھی دیتے تھے، البتہ شائستگی اور حفظ مراتب کا خیال رکھتے ہوئے۔ ان کے کلام میں تصوف و عرفان اور حکمت کی باریکیاں بھی مشہود و محسوس ہیں۔

شیخ سعدی ساتویں صدی ہجری کی آخری دہائی تک شیراز میں عزت و احترام کے ساتھ رہے اور ۶۹۱ اور ۶۹۴ ہجری کے درمیان انتقال فرمایا۔ شیراز میں ان کا مزار اہل دل کی زیارت گاہ ہے۔ شیخ کی شاعری سے متعلق اس کی تعریف میں خود شیخ بزرگوار کی زبانی یہی کہوں گا کہ:

مـن درهـمـــه قـولهـا فـصيـحـم

در وصف شـمـــايـل تـواخــرس

(میں ہر بات میں فصیح ہوں، لیکن تمہاری خوبصورتی کی تعریف میں خاموش ہوں)

اگر ہم ان کی شاعری کو شیریں یا نمکین کہیں تو یہ ایک سطحی تعریف ہوگی اور ان کے شایانِ شان نہیں، لیکن اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ وہ سب سے فصیح شاعر اور سب سے بلیغ مصنف ہیں تو یہ ایک ایسی بات ہے جس پر سب متفق نظر آئیں گے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان کی شاعری رواں اور سہل ممتنع ہے تو یہ ایک پرانی بات ہے اور سب اس بات کے معترف ہیں۔

حق تو یہ ہے کہ سعدی کی شاعری کے اوصاف بیان کرنا آسان نہیں۔ ان کی شاعری اُس صاف پانی کی طرح ہے جو ایک شفاف شیشے میں ہے، جس کی شفافیت کے باعث آنکھیں ظرف اور مظروف کا فرق نہیں کر پاتیں۔ ان کی شاعری ہوا کی نرمی اور ملائمت کی طرح ہے جس کے روح پرور ہونے میں کسی کو تردد نہیں، لیکن اگر کوئی اس کی لذت کو بیان کرنا چاہے تو اس کے علاوہ کہ وہ جاں بخش ہے، اس کے پاس کچھ کہنے کو نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ لوگ سعدی کی شاعری سے واقف ہیں، لیکن بہت کم لوگ ہیں جو اس کی خوبی کو واقعتاً سمجھتے ہیں، ورنہ عموماً جو تعریفیں کی جاتی ہیں وہ روایتی، سنی سنائی اور دانشمندوں کے اقوال کی مکرر نقلیں ہیں۔

سعدی مملکتِ سخن کے مسلم بادشاہ ہیں۔ بیان پر ان کا تسلط بے بدل ہے۔ ان کے کلام میں سوز و گداز ہے۔ ان کے ہاتھ میں شاعری موم کی طرح ہے۔ وہ ہر مضمون کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ شاید اس سے بہتر، خوبصورت اور موثر صورت بیان ممکن نہیں۔ ان کی شاعری حشو و زوائد سے پاک اور ایرانیوں کے ذوقِ شعری کی حقیقی ترجمان ہے۔

شیخ سعدی نے نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی اسی انداز کو برقرار رکھا ہے چنانچہ ان کی نثر میں شاعری کا ذائقہ ہے اور ان کی شاعری میں نثر کی روانی۔ بلاخوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''گلستاں'' کے بعد فارسی نثر کو اس کی مناسب جہت ملتی ہے اور سعدی کی تقلید میں نثر لکھی جانے لگتی ہے اور ان کے رشحاتِ قلم کے فیض سے فارسی شاعری اور نثر کی زبان، دوگانگی سے نکل کر ایک زبان بنتی ہے۔

سعدی کی شاعری اور نثر کی خوبصورتی اور مضامین و معانی کی لطافت پر ہم جس قدر حیرت کریں، کم ہے۔ ان کے بارے میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دنیا کے ان چند سخنوروں میں ہیں جن کا شعار لفظی نہیں ہے۔ سعدی کی ''بوستاں'' اور ''گلستاں'' حکمتِ عملی کا ایک مکمل نصاب ہیں۔ انہوں نے سیاست، اخلاقیات اور سماجی علم کو نکھارا ہے اور ان دونوں کتابوں میں اسے دلکش ترین عبارات اور حکایات کے قالب میں پیش کیا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ نہایت سنجیدہ موضوع ہیں، سعدی نے طنز و ظرافت سے بھی بہ نحو احسن کام لیا ہے۔ وہ خود فرماتے ہیں:

''نصیحت کی تلخ دوا کو ظرافت کے شہد میں ملا دینے سے

طبیعت کسی اکتاہٹ کے بغیر اسے قبول کر لیتی ہے۔''

یہ سچ بھی ہے۔ اگر ذرا ذوق ہو اور ''بوستاں'' اور ''گلستاں'' کو بار بار پڑھا جائے تو اکتاہٹ بالکل نہیں ہوتی۔

یہ بات بھی اہم ہے کہ سعدی کی طرح کسی نے حکمراں طبقے کو اچھی سیاست، انصاف اور رعیت پروری کی دعوت نہیں دی ہے اور نہ اس امر کی اہمیت اور ضرورت کی طرف ان کی طرح حکمرانوں کی توجہ مبذول کی ہے۔ سعدی یہیں نہیں رک جاتے، وہ ہر طبقے اور ہر طبقے کے لوگوں کو چاہے وہ درویش ہو یا بادشاہ، امیر ہو یا وزیر، فوجی، شہری، طاقتور، کمزور، زاہد، دیندار، عارف، تاجر، عاشق، رند، آخرت اندیش یا دنیا پرست اپنا اخلاقی پیغام دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ جو بھی سعدی سے مانوس ہوتا ہے وہ ناچار ان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ ❁❁

خریدار اور کرم فرما حضرات سے......

''زبان و ادب'' کی تازہ اشاعتیں، خریدار اور کرم فرما حضرات کے پتہ پر بروقت بھیج دی جاتی ہیں۔ پرچہ سادہ ڈاک سے روانہ کیا جاتا ہے۔ پرچہ کے تاخیر سے ملنے یا نہیں پہنچنے کی صورت میں، اپنے علاقہ کے ڈاکیہ اور مقامی ڈاک خانے سے رجوع کریں۔ ادارہ ڈاک میں پرچہ کی گم شدگی کا ذمہ دار نہیں۔

ڈاکٹر منصور خوشتر

Editor "Darbhanga Time" Purani Munsafi, Darbhanga - 846004 (Mob. 9234772764)

شوکت حیات: اردو افسانے کی منفرد آواز

جدیدیت سے انامیت اور انامیت سے اجتماعیت تک کا بہت ہی کامیاب سفر طے کرنے والے معروف افسانہ نگار کا نام شوکت حیات ہے۔ اپنے عصر کے زمانی اور مکانی احساسات کو جس طرح شوکت حیات نے تخیئلی طور پر سوچا اور تخلیقی طور پر برتا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ ان کی کہانیاں ادبی شعور کے ساتھ ذہنی ارتقا سے گہرا ربط رکھتی ہیں۔ شوکت حیات نے سائنسی بصیرت اور عہد موجود کی کڑوی سچائیوں کو ساتھ لے کر دور رس روشنیاں بکھیری ہیں۔ انہوں نے اردو افسانے کو امکانیت کی نئی تھیوری دیتے ہوئے، اپنے ہم عصروں کے درمیان منفرد شناخت قائم کی ہے۔ ستر کے بعد کے افسانہ نگاروں میں شوکت حیات بلند مقام پر نظر آتے ہیں۔ ان کا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' اس امر کا بین ثبوت ہے۔

اپنی Redical فکر اور طرز احساس کے ساتھ انقلابی ذہن رکھنے والے اس افسانہ نگار نے نہ صرف اپنی انفرادی شناخت بنائی بلکہ انام نسل کے حوالے سے انہوں نے کئی مضامین بھی لکھے ہیں جنہیں کہانی پسند قارئین کبھی بھلا نہیں پائیں گے۔ سلگتے احساس کی ترجمانی کرنے والے شوکت حیات کی کئی کہانیاں اپنے عہد کی نمائندگی کرنے کے ساتھ اپنے عہد سے بہت آگے کا سفر طے کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ رنگ برنگے سیاسی، سماجی اور معاشیاتی منظر کی دیواروں پر وقت کا سچا محضر لکھنے کا ہنر شوکت حیات کو خوب آتا تھا۔

شوکت حیات یکم دسمبر ۱۹۵۰ء کو پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۷۰ء میں پٹنہ یونیورسٹی سائنس کالج سے گریجویشن کی ساتھ ہی مگدھ یونیورسٹی سے اردو میں طلائی تمغے کے ساتھ ایم اے کی سند حاصل کی۔ وہ یو جی سی (نیٹ کوالیفائیڈ) تھے۔ وہ اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھتے تھے۔ ان کی پہلی کہانی ''بکسوں سے دبا آدمی'' ماہنامہ ''کتاب'' لکھنؤ میں شائع ہوئی تھی۔ ان کی کہانیوں میں اکثر قیاس آرائی، سپاٹ بیانیہ اور کبھی کبھی ترقی پسند تحریک کے بنیادی اقدار شامل ہوتے ہیں اور بعض اوقات کہانی سنانے سے انحراف ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانی ''گنبد کے کبوتر'' کے لئے مشہور ہیں۔ ان کا انتقال ۲۱/اپریل ۲۰۲۱ء بروز بدھ ہوا۔ اپنے افسانے کے تعلق سے شوکت حیات لکھتے ہیں:

> ''میرے افسانے اس تناظر میں دیکھیں جائیں کہ یہ وہ جدید اور مابعد جدید افسانے ہیں جو دراصل نامیاتی اور امکانی ہیں اور انامیت، نامیاتیت اور امکانیت پسندی کے سرمدی اوصاف سے مملو ہیں۔ ان میں آج کے عہد اور آج کے انسان، اس کے مسائل کو نئے ڈھنگ، لہجے، تکنیک، ٹریٹمنٹ، موضوع، فکری بصیرت اور تیور کے ساتھ دریافت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔''

شوکت حیات کے افسانوں کا فکری محور انسان ہے۔ وہ فرد کے داخلی اور خارجی بحران کا مطالعہ اس کے سماجی احوال کے ساتھ کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے بعض کرداروں کے ذریعہ سماج کے کھوکھلے نظام اور دوغلے رویوں کے خلاف پرزور آواز بلند کی ہے۔ اخلاقی وجذباتی بحران، سماجی وسیاسی ظلم وجبر، مسابقتی عہد میں زندگی کی بے مقصدیت اور بے معنویت، عالمی دہشت گردی کے نتیجے میں پنپنے والی بے یقینی اور بے نام خوف، طبقاتی استحصال کے منطقی نتائج وغیرہ کو انہوں اپنے افسانوں کے وسیلے سے پیش کیا ہے اور ان تمام مراحل میں تخلیقی ضبط کے دامن کو خوش اسلوبی سے تھامے رکھنا ہی ان کا فنی امتیاز ہے۔ بقول وہاب اشرفی:

> ''وہ پختہ ذہن فنکار کی طرح آہستہ آہستہ اپنے ذہن کی تصویر کو مکمل کرتے ہیں اور اس کی تکمیل میں مناسب رنگ بھرتے ہیں جو ہر طرح متوازن بھی ہوتا ہے۔ اب

جو تصویر سامنے آتی ہے وہ حقیقت واقعہ کا عکس محض نہیں ہوتی بلکہ اس کے اندر ایک ایسی تخلیقی جوت ہوتی ہے جو اس کی شدت کو سرتا سر بڑھا دیتی ہے۔ ایک انقلابی ذہن میں کیسی کیسی تخلیقی روشنی پیدا ہوسکتی ہے، اس کا ایک مکمل منظر نامہ شوکت حیات کے افسانے ہیں۔ اردو افسانے کی مجموعی تاریخ میں ان کی جگہ معتبر بھی ہے اور محفوظ بھی۔''

شوکت حیات کے تعلق سے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے بڑی عمدہ باتیں پیش کی ہیں۔ ان کے افسانے کے تعلق سے وہ لکھتے ہیں:

''شوکت حیات افسانوی ادب میں 'اکہانی' کی آواز بلند کرتے ہوئے ساتویں دہائی میں داخل ہوئے۔ یہ اینٹی اسٹوری لکھنے کی تحریک تھی جس کے ڈانڈے بلراج مینرا کی 'کمپوزیشن سریز' سے ملتے تھے۔ شوکت حیات نے بھی ایسی کہانیاں بڑی تعداد میں لکھیں اور کمپوزیشن سریز کی طرح 'سچویشن سریز' کی کہانیاں بھی لکھیں، مگر ان کی شناخت احتجاج پر مبنی افسانے 'بانگ' سے قائم ہوئی۔ یہ وہ وقت تھا جب شوکت حیات نے محسوس کرلیا تھا کہ 'اکہانی' مشرقی مزاج سے لگا نہیں کھاتی، لہٰذا 'بانگ' شوکت حیات کے ساتھ ساتھ اردو افسانے کا بھی Turning Point ثابت ہوا جس میں علامت کا پردہ بہت باریک ہے اور احتجاج کی لے دبیز۔ یہ افساد متشدد قسم کے علامتی اور Plotless افسانوں کے خلاف بھی احتجاج تھا جس کے آر پار بڑی آسانی سے فن کے ساتھ افسانے کے مستقبل کو دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کے بعد شوکت حیات کے اکثر افسانے بیانیہ لہجہ لئے ہوئے سامنے آئے، مگر ان کا بیانیہ بالکل برہنہ اور شفاف نہیں ہوتا۔ وہ ہلکے سے ابہام اور پردہ داری کے قائل ہیں جو تخلیق کے حسن کو بڑھاتی ہے اور تاثر کی شدت میں سرتاسر اضافہ کرکے نیا رنگ پیدا کرتی ہے۔''

شوکت حیات نے سن ستر کی دہائی سے افسانہ نگاری کی ابتدا کی اور ان کے سو سے زائد افسانے معتبر و موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوئے، لیکن ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''گنبد کے کبوتر'' ۲۰۱۰ء میں منظر عام پر آیا۔ تقریباً چالیس سالہ افسانوی سفر کے دوران مجموعہ شائع نہ کرانے کا سبب خواہ جو بھی ہو، لیکن ابرار رحمانی کے لفظوں میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کتاب گردی کے اس دور میں بھی شوکت حیات کا اس طرف دھیان نہ دینا ان کے جینوئن فنکار ہونے پر دال ہے۔ ''گنبد کے کبوتر'' ان کی پچیس کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ ان کہانیوں میں سے بہترین، اوسط یا کمزور کہانیوں کی درجہ بندی مشکل ہے، کیونکہ ہر افسانہ زندگی کے نئے افق، معاشرے کے نئے پہلو کو پیش کر رہا ہے۔ کوئی افسانہ کردار کا افسانہ ہے تو کوئی واقعات کا، کوئی احساس کے پیچ وخم کھول رہا ہے تو کوئی تاریخی لمحے کی خطا کو گرفت میں لے رہا ہے، کہیں عشق کا ترفع ہے تو کہیں دبی کچلی نفرت کا ترشح۔ ہر افسانے کی قرأت ایک جہان دگر کی سیر کراتی ہے۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد رقم طراز ہیں:

''افسانوی مجموعے کی فہرست کے مطابق اس طرح کا پہلا افسانہ 'رانی باغ' ہے۔ اس پر شوکت کے اپنے نظریۂ حیات کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور پر رحمت صاحب کا امریکہ سے ہندوستان واپس آکر اپنے آبائی گاؤں میں قیام کرنا، وہاں کی بچی کھچی جائیداد مارکسی انقلابیوں کے سپرد کر دینا اور خود بھی ان کی تحریک میں یہ کہتے ہوئے شامل ہوجانا کہ 'ہم شعلے نہیں رہے، مگر ایندھن کا حصہ تو بن ہی سکتے ہیں'۔ افسانہ نگار کے نقطۂ نظر کا واضح اشارہ ہے، مگر میری نظر میں افسانے کے دو اور پہلو ایسے ہیں جو قابل توجہ ہیں۔ ایک تو اس کا آغاز ہے۔ رحمت اور رانی کا افلاطونی عشق جو خاصے روایتی انداز میں شروع ہوتا ہے اور اسی انداز سے جاری رہتے ہوئے انجام تک پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے بین المذاہب

عشق وعاشقی کی ہمارے معاشرے میں آج بھی گنجائش نہیں اور کل تو اور بھی نہیں تھی۔ ایسے میں رحمت صاحب کا امریکہ چلے جانا اور رانی کے گھر والوں کا اس کی شادی کر دینا حقیقت پسندانہ بیان ہے، مگر میرا سوال یہ ہے کہ آخر اس میں شوکت حیات کا انفرادی رویہ کہاں ہے۔ ایسا تو دوسرے افسانوں میں بھی ہوتا رہا ہے۔ دوسرا پہلو اسلوب سے متعلق ہے۔ پوری کہانی بیانیہ کے پیرائے میں ہے۔ فطرت کا بیان ہو یا پھر ناسٹلجک رجحان کا، ہر جگہ انداز بیان سادہ ہے۔ کوئی استعارہ یا علامت نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ تشبیہات بھی سامنے کی اور کلاسیکی انداز کی ہیں۔ گویا افسانہ روایت سے بہت قریب ہے۔'' (دربھنگہ ٹائمز، یادرفتگاں نمبر، ص ۱۷۱)

فرقہ وارانہ فسادات اور مشترکہ کلچر کے زوال کے علاوہ پرانی تہذیبوں اور قدروں کی شکست وریخت بھی شوکت حیات کے یہاں نظر آتی ہے۔ صداقت وبصیرت اور روایات واقدار کی تلاش، انسان کے مقدر کی شدید جستجو، موت کی قطعیت اور حیات بعد الموت کی پیچیدگی اور زندگی کی معنویت سے محروم ہو جانے کے احساس کو انہوں نے اپنے کئی افسانوں میں بڑی خوبصورتی سے برتا ہے۔ ایسا ہی ایک افسانہ ''گھونسلا'' ہے جس میں ایک شخص برسوں بعد اپنے شہر لوٹ کر گھپ اندھیری رات میں اپنے گھر کی تلاش میں نکلتا ہے۔ وہ رکشے میں سوار ہو کر پورے شہر کا چکر لگا تا ہے اور بار بار رکشے والے کو نئے راستوں سے چلنے کی ہدایت کرتا ہے، لیکن ہر بار اسے مایوس ہونا پڑتا ہے۔ رکشے والا جو لوٹ کر آنے والے مسافر شخص کا باپ ہے اور جو خود بھی گھر سے محروم ہو چکا ہے، ناکام تگ و دو کے بعد بالآخر اس مطلوبہ ٹھکانے کا انکشاف کرتا ہے جو اب صاف اور چٹیل میدان کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ رکشے پر سوار شخص اپنے ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے بے چین ہے۔ اس تمثیلی کہانی میں شناخت کے آثار سے محروم ہو جانے والا اصل ٹھکانہ (چٹیل میدان) پرانی روایت اور تہذیب کا امین ہے اور اس ٹھکانے سے سفر کرنے والے شخص کا روحانی اور جذباتی تعلق ہے۔ زندگی ایک سفر ہے اس لئے افسانہ بھی سفر سے شروع ہوتا ہے اور تا آخر سفر جاری رہتا ہے۔ وہ شخص بار بار راستے بدلتا ہے، لیکن سارے راستے اسے اسی چٹیل میدان تک پہنچاتے ہیں۔ اس نے مندر، مسجد، چرچ اور گردوارے کا راستہ بھی اختیار کیا، لیکن یہ بھی اسے وہیں تک پہنچا سکے یعنی مذہب جو روحانی اقدار وافکار کے تحفظ کا وسیلہ ہے وہ بھی مٹتی ہوئی تہذیبوں اور فنا پذیر قدروں کو محفوظ نہ رکھ سکا اور نئی تہذیبیں ان پر حاوی ہو گئیں۔

شوکت حیات کے افسانوں کا مکالمہ بھی بہت عمدہ ہوا کرتا ہے۔ ایک خاص انداز میں افسانے کے کردار گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''بھائی'' سے ایک مکالمہ ملاحظہ فرمائیں:

> ''کئی چہرے آگے آئے اور چاروں طرف سے انہوں نے ٹمپو کو گھیر لیا۔ غالباً تندرست آدمی کی شناخت سے ان میں سے کئی لوگ واقف تھے۔ دبلے آدمی کی طرف وہ لپکے: 'تم اپنا نام بتاؤ؟' ......'راجہ'......'پورا نام ......' تندرست ہم سفر نے فوراً اپنے ہونے کا احساس کرایا: 'نام کیا پوچھنا ہے۔ یہ میرا بھائی ہے'......'جھوٹ، پینٹ اتارو' کسی کینہ پرور اور شر پسند نے زمین پر اپنی لاٹھی پٹکتے ہوئے کہا۔ ان میں سے کئی ہنسنے لگے۔ کئی واقعی پینٹ کھول کر دبلے آدمی کی بے حرمتی کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ اسی وقت اس تندرست آدمی نے بل کھاتے ہوئے زوردار آواز میں چیخ لگائی: 'خبردار! میری لاش سے گزر کر ہی یہ کام کر سکتے ہو۔''

شوکت حیات کے افسانوں کا اسلوب بھی نرالا ہے۔ وہ اپنے منفرد انداز میں افسانے کے بیانیہ میں دلکشی پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''گھونسلا'' سے ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

> ''دباؤ بڑھتا گیا۔ اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ آس پاس بیٹھے ہوئے مسافروں نے اسے حیرت واستعجاب سے دیکھا اور اس مغالطے میں مبتلا ہو گئے کہ اسے قلب کا دورہ پڑنے والا ہے۔ اس نے دھیرے دھیرے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے سوچا کہ سچ مچ اس کا اور

اس کے جیسے کروڑوں لوگوں کا اس بھری پری دنیا میں کہیں کوئی اسٹیشن نہیں...... پورے سفر میں دو افراد کے متعلق وہ شدت سے سوچتا رہا تھا۔ ایک وہ جس سے اس کا خون کا رشتہ تھا، اس کا باپ۔ اور دوسرا وہ جس سے کسی طرح کا کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ایک عجیب سانا معلوم تعلق تھا، جس کے ادھ کھلے ہونٹ کا ذائقہ اب بھی اس کی شریانوں میں سنسنی کی لہر دوڑا دیتا تھا اور جس کے سانولے سلونے وجود کے تصور کی گرمی بھی خود اس کے وجود کو موم کی طرح پگھلا کر رکھ دیتی تھی۔ یہ لوگ ملاقات ہونے پر کسی طرح چونک جائیں گے۔ پہلے تو حواس باختہ ہو جائیں گے، پھر جب ان کے اوسان بحال ہوں گے تو سوچیں گے کہ آنِ واحد میں انہیں فرطِ انبساط کی کیسی بیش بہا دولت مل گئی۔''

اس طرح شوکت حیات کے افسانے سماجی، سیاسی، ثقافتی اور تہذیبی حالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں سماجی اصلاح کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ شوکت حیات کے بعض افسانوں کے واقعات اور کردار پہلی نظر میں فرضی معلوم ہوتے ہیں، لیکن جیسے جیسے آپ اس کردار کی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ واضح ہوتا چلا جاتا ہے کہ ایسا ممکن ہے، چاہے ایک لاکھ میں کوئی ایسا واقعہ اکیلا ہی کیوں نہ ہو۔ میں نے ذاتی طور پر ان کے افسانوں کا مطالعہ بھی کیا ہے اور مشاہدہ بھی۔ وہ ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نئی تکنیک پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔

افسانے کے فنی تصورات پر جب نقاد گفتگو کرتے ہیں تو وہ شوکت حیات کی فنی بالیدگی اور ان کے کینوس کی بوقلمونی سے متحیر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ ان کے یہاں اخلاقیات کی کچھ حدیں مقرر ہیں، وہ ان سے کبھی گریز نہیں کرتے۔ جملوں میں ایسی چاشنی پیدا کرتے ہیں کہ اس میں خود بہ خود تہذیبی رومانیت ابھر آتی ہے اور وہ قاری پر ایک نشہ بن کر اس پر ایسا سحر طاری کرتی ہے کہ وہ اس میں اپنی زندگی کے نا آفریدہ نقوش تلاش کرنے لگتا ہے۔

شوکت حیات جب نظام اقتدار کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس نظام سے وابستہ کرداروں پر گفتگو کرتے ہیں تو ان کرداروں کی منافقتیں خود بہ خود قاری کے روبرو ہو جاتی ہیں۔ یہ کردار اپنے سیاسی مفاد کے لیے سماجی اور مذہبی منافرت کو کس طرح پروان چڑھاتے ہیں، اس کا ایسا منظر سامنے آتا ہے، جیسے یہ بالکل سامنے کی بات ہو۔

جب ہم شوکت حیات کی تحریروں میں حزن ویاس اور المیہ عناصر کو تلاش کرتے ہیں تو ان کی تحریروں کے آہنگ میں ارسطو کی ''بوطیقا'' پوری طرح اپنی تمام کیفیتوں کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک المیہ کا اہم ترین اصول پلاٹ ہے اور یہی المیہ کی روح بھی ہے۔ پلاٹ کی ترتیب میں خارجی عوامل کے بجائے داخلی وحدت کو پیش نظر رکھنا از بس ضروری ہے۔ شوکت حیات کے یہاں افعال ان کے کرداروں کے تابع ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے کرداروں پر جو صدمے گزرتے ہیں، ان کے کردار ان سے پریشان نہیں ہوتے، بلکہ ان میں امید کی ایک خوشگوار کرن نظر آتی ہے اور ان کی امید مرگِ ناگہاں پر جب اختتام کو پہنچتی ہے تو بظاہر ان کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے، لیکن ان کے دلوں میں ایک جذبہ جنوں اپنی حقیقی ترجمانی کرتا نظر آتا ہے اور ان کو شوکت حیات کا خاص اسلوب نئی اثر آفرینی عطا کرتا ہے۔

لارنس نے لکھا ہے کہ ''فکشن جب تک فلسفہ نہ بن جائے بڑا فکشن کہلائے جانے کا مستحق نہیں ہوتا۔'' اس بات کو اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ ہر واقعہ کوئی عمدہ اور بہترین کہانی نہیں ہوتا۔ البتہ فکشن نگار کا تخلیقی ذہن اور وژن کسی معمولی واقعے کو بھی غیر معمولی بنا دیتا ہے۔ شوکت حیات اس معاملے میں بھی اپنے عہد کیا مابعد عہد کے تخلیق کاروں سے دو قدم آگے ہی ہیں، وہ آگے کی سوچتے ہیں اور پیش آمدہ واقعات کی روشنی میں مابعد اپنے فکری تنوع کے سبب ایسا خیال پیش کرتے ہیں جو واقعی آنے والے وقت کے لیے ایک شہادت بن جاتا ہے۔ ان کی تخلیق کی گہرائی اور تہہ داری کو سمجھنے کے لیے حالات سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جب تک قاری اپنے معاشی، سیاسی اور سماجی سروکار سے واقف نہیں ہوگا، اسے شوکت حیات سمجھ میں نہیں آئیں گے۔

❁❁❁

ڈاکٹر محمد اعجاز احمد
Director, "Idarah Tahqiqat Arbic & Persion" Patna

غلام مجتبیٰ انصاری: سوانح، شخصیت اور فارسی خدمات

برصغیر ہندوپاک کا دامن عاطفت علوم مشرقیہ کے لیے ہمیشہ بہت ہی وسیع رہا ہے، خصوصاً فارسی زبان وادب کو ایران کے بعد ہندوستان میں جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور جس طرح عوامی سطح پر اس نے شرف قبولیت پایا، وہ شاید دیگر مشرقی زبانوں کے حصہ میں نہ آسکا۔ ہندوستان میں صدیوں تک فارسی زبان وادب کو سرکاری سرپرستی حاصل رہی۔ اگر ایسٹ انڈیا کمپنی نے ۱۸۳۵ء میں فارسی کو دربدر نہیں کیا ہوتا اور اردو کو سرکاری زبان نہیں بنایا ہوتا تو فارسی کو ہندوستان میں مزید استحکام حاصل ہو جاتا، علم لسانیات کا یہ فطری اصول ہے کہ زبان اپنی شیرینیت اور جاذبیت کی وجہ سے اپنا قاری خود پیدا کر لیتی ہے۔ یہی اصول اردو کے ارتقائی سفر کا بھی موجب بنا اور یہی اصول فارسی کے ساتھ بھی کارفرما رہا۔ سرزمین ہند میں فارسی نے ناموافق حالات میں بھی اپنی منفرد خصوصیات کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اپنے وجود کو باقی رکھا بلکہ اپنا ارتقائی سفر بھی جاری رکھا۔ اس لسانی سفر کو جاری رکھنے میں جن دانشوروں کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے، ان میں پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کا نام اور ان کی شخصیت بہت ہی نمایاں اور قابل قدر ہے۔ مابعد آزادی، بہار کی سرزمین میں فارسی زبان کے قافلہ میں پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری آخری مسافر تھے جنہوں نے اپنی پوری زندگی فارسی زبان کی خدمت اور اس کے فروغ میں گزار دی اور اپنی نثری وشعری اور تنقیدی تخلیقات کے ذریعہ نہ صرف فارسی زبان کو زندہ رکھا بلکہ اپنی قیمتی تخلیقات کے ذریعہ فارسی زبان وادب کے سرمایہ میں گراں بہا اضافہ بھی کیا۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کوئی بھی عبقری شخصیت جو اپنی دانشوری کے ذریعہ اچھے اخلاق وعادات کا مظاہرہ اپنی علمی زندگی میں کرتی ہے، وہ صدیوں کا خاندانی پس منظر بھی یقیناً رکھتی ہے۔ غلام مجتبیٰ انصاری اس معاملے میں خوش قسمت تھے کہ ان کو خاندانی وراثت میں ایک دینی وادبی ماحول ملا جس نے ان کے تعلیم وتربیت کو جلا بخشا۔

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کی پیدائش ویشالی ضلع کی ایک مردم خیز بستی عطاء اللہ پور میں ۱۸ مئی ۱۹۳۸ء میں ہوئی۔ ان کے والد مولانا محمد نصیرالدین ایک مستند عالم دین تھے، جنہوں نے دارالعلوم دیوبند جیسے عالمی سطح کے ادارہ سے فراغت حاصل کی تھی۔ وہ ایک باعمل عالم دین تھے جو لعل گنج کے ایک اسکول میں بحیثیت معلم تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ غلام مجتبیٰ انصاری نے اپنے والد گرامی کے سایہ عاطفت میں ابتدا سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد پٹنہ یونیورسٹی میں فارسی مضمون کے ساتھ انٹرمیڈیٹ میں داخلہ لیا اور پھر اسی یونیورسیٹی سے ۱۹۵۴ء میں انٹرمیڈیٹ، ۱۹۵۶ء میں بی۔اے۔آنرس (فارسی) ۱۹۵۸ء میں ایم اے فارسی اور ۱۹۶۰ء میں اردو ایم۔اے کا امتحان دیا اور اعلیٰ نمبروں سے کامیابی حاصل کیا، پھر پروفیسر محمد صدیق نگرانی میں ڈاکٹریٹ بھی کیا۔ ان کے تحقیقی مقالے کا موضوع ''درویش حسین والہ ہروی: حیات وخدمات'' تھا۔ بعدازاں انہوں نے حکیم شیخ حسین شہرت شیرازی کی شخصیت اور علمی کارناموں پر تحقیقی مقالہ لکھا جس پر وہ ڈی لٹ کی ڈگری سے نوازے گئے اور جواہر لال نہرو یونیورسیٹی دہلی نے بھی انہیں جدید فارسی میں جواز عطا کیا۔

یہی وہ خاندانی وعلمی پس منظر تھا جس میں غلام مجتبیٰ انصاری کا ذہنی نشو ونما ہوا اور بالآخر وہ اپنی عملی زندگی میں ایک منکسرمزاج اور مہمان نواز فرد کی شکل میں نمایاں ہوئے۔ بارہا ایسا ہوا کہ کوئی مہمان آیا تو اپنی تمام تر مصروفیات کو ترک کر کے مہمان نوازی میں مصروف ہوگئے۔ ان کے یہاں جو مہمان دور سے آتے انہیں ہم طعامی سے نواز کر شب کے قیام کا بھی انتظام کرتے تھے۔ بعض ایسے افراد سے بھی راقم الحروف کی ملاقات ہوئی جو پروفیسر مجتبیٰ انصاری کی مہمان نوازی کا

بہت احترام کے ساتھ تذکرہ کرتے ہیں۔بعض افراد نے تو یہاں تک کہا کہ مجھے جب مجتبیٰ انصاری صاحب کے یہاں مہمان بننے کا موقع ملا تو ایسا محسوس ہوا کہ میں کسی پروفیسر سے نہیں بلکہ ایک درویش صفت بزرگ سے مل کر آرہا ہوں۔

مہمان نوازی کے علاوہ مجتبیٰ انصاری صاحب کی ایک منفرد خصوصیت لوگوں کے ساتھ حسن سلوک تھا۔ جاننے والے اور حلقہ احباب کے ساتھ تو وہ حسن سلوک کے ساتھ پیش آتے ہی تھے، اکثر و بیشتر اجنبیوں کے ساتھ بھی اچھا سلوک جاری رکھتے تھے۔ وہ حاجت مندوں سے عدم واقفیت کے باوجود نہ صرف یہ کہ حسن سلوک سے پیش آتے بلکہ حتی الامکان ان کی حاجت روائی کے ساتھ مالی معاونت بھی فرماتے تھے۔راقم الحروف نے بارہا ایسا واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

پروفیسر مجتبیٰ انصاری صاحب نے اپنے تدریسی کیریر کا آغاز سہرسہ کالج سہرسہ سے کیا جہاں ۱۹۶۱ء میں ان کی تقرری شعبہ فارسی میں لکچرر کی حیثیت سے ہوئی، حالاں کہ اس سے قبل بہار کوآپریٹو سوسائٹی میں انسپکٹر کے عہدے پر موصوف کی بحالی ہوچکی تھی، لیکن وہاں کا روایتی دفتری ماحول مجتبیٰ انصاری جیسے درویش صفت انسان کو راس نہیں آیا، چنانچہ جلد ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے اس نیک بندے کو کوئلے کے کان سے نجات دلا کر لکچرر شپ جیسے باعزت عہدے تک پہنچا دیا۔یعنی ان کا تبادلہ ٹی۔این۔بی۔کالج بھاگلپور کے شعبۂ فارسی میں ہوگیا، جہاں ۱۹۸۲ء تک وہ تدریسی فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔بعدازاں جولائی ۱۹۸۲ء میں ان کا تبادلہ بہار یونیورسیٹی مظفر پور میں ہوا، جہاں کے شعبۂ فارسی میں ریڈر کی حیثیت سے انہوں نے جوائن کیا اور ترقی کر کے پروفیسر اور پھر صدر شعبۂ فارسی کے عہدہ جلیلہ تک پہنچے۔ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ ذہنی یک سوئی اور جسمانی آرام سکون چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے علم وادب کے مرکز عظیم آباد کے لئے رخت سفر باندھا اور نیو عظیم آباد کالونی، پٹنہ کو اپنا مسکن بنایا اور علم وادب تحقیق وتخلیق کے کاموں میں فطری طور پر مصروف رہے۔اکیسویں صدی کے اوائل میں موصوف عمر طبعی کو پہنچ چکے تھے، اس لئے مختلف قسم کے جسمانی عوارض کے شکار ہوگئے اور آخر کار سفر آخرت کی طرف روانہ ہوگئے۔

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کے ہم عصر اساتذہ فارسی میں پروفیسر غفار انصاری، پروفیسر متین احمد صبا، پروفیسر شبیر حیدری، پروفیسر زبیر احمد قمر، پروفیسر ناظر صدیقی، پروفیسر عبد الغفور شمس وغیرہ نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں، بعدازاں پٹنہ کے قیام کے زمانہ میں بھی مرحوم کے معاصر فارسی دانشوروں کا اپنا ایک حلقہ رہا مثلاً پروفیسر انوار صاحب، پروفیسر محمد صدیق، پروفیسر شرف عالم، پروفیسر غفار صدیقی، پروفیسر عابد حسین وغیرہ۔مذکورہ معاصر پروفیسروں میں پروفیسر عبدالغفور اور پروفیسر عابد حسین دونوں حضرات بہت ہی جونیر تھے بلکہ اگر ان دونوں کو مجتبیٰ انصاری مرحوم کے شاگردوں کے زمرے میں رکھا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ مرحوم کے یہ معاصرین فارسی زبان وادب کی معتبر شخصیات میں شمار ہوتے تھے۔علاوہ ازیں بیرون بہار بھی مجتبیٰ انصاری کے ہم عصر فارسی دانشوروں اور پروفیسروں کا ایک بڑا حلقہ تھا جس میں پروفیسر عبدالودود اظہر کا نام نمایاں طور پر لیا جاسکتا ہے۔مذکورہ سبھی معاصرین کے ساتھ مجتبیٰ انصاری صاحب کے مراسم بہت خوشگوار اور دوستانہ تھے۔اگرچہ بعض حضرات سے نظریاتی اختلافات بھی تھے، لیکن انہوں نے ان اختلافات کو کبھی تعلقات میں حائل نہیں ہونے دیا۔یہ حضرات جب گھر آجاتے تھے تو ان کی پرخلوص مہمان نوازی کرتے اور اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر پھر وہی خوش گپیاں اور بزم یاراں کی محفلیں منعقد ہوتیں۔معاصر پروفیسروں کے یہاں خوشی وغم کے موقع پر خود بھی تشریف لے جاتے اور انہیں اپنے گھر بھی بلاتے۔غرض کہ بعض جزئیات کو چھوڑ کر موصوف کے معاصرین کے ساتھ بہت ہی خوش گوار تعلقات تھے۔

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری مرحوم کو فارسی زبان وادب کے دانشور ہونے کے علاوہ سماج کے دیگر شعبوں میں بھی کافی مقبولیت حاصل تھی۔ان کی شخصیت میں اخلاق ومحبت اور عاجزی وانکساری کا جذبہ اس قدر تھا کہ کوئی اجنبی شخص بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا تھا۔ ان کے مزاج میں ایک خاص بات یہ تھی کہ مختلف موضوعات پر گفتگو کے دوران جب کوئی بات طبع نازک پر گراں گزرتی تو اسے مسکرا کر ٹال دیتے تھے، البتہ اگر بات حق وباطل یا مذہبی اختلاف کی ہوتی تو حق بات پر پوری قوت ارادی کے ساتھ ڈٹ جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ کسی بھی

موضوع پر ان کی رائے حتمی ہوا کرتی تھی۔

پروفیسر انصاری مرحوم اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ بہت ہی شفقت ومحبت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ کوئی عزیز یا رشتہ دار اُن کے پاس آتا تو اسے شفقت ومحبت کے ساتھ پاس میں بیٹھاتے اور اس سے خبر وخیریت لیتے، مزاج پرسی کرتے اور اگر کوئی ضرورت ہوتی تو اس کی حاجت روائی کرتے۔ اگر خدانخواستہ تعاون نہیں کر پاتے تو خوش اسلوبی کے ساتھ معذرت کرتے اور مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکالتے۔ اس طرح حاجت مند خوش ہو کر واپس لوٹتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ رشتہ داروں میں جو لوگ شرم کے مارے منھ نہیں کھولتے ان کی مدد ایسی خاموشی سے کرتے کہ ان کے اہل وعیال کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب موصوف کی وفات کے بعد بعض ایسے لوگ بھی آئے جس کے ساتھ مرحوم نے حسن سلوک یا احسان کا معاملہ کیا تھا۔

پروفیسر مجتبیٰ انصاری کے شاگردوں کی تعداد بھی بے شمار تھی۔ ان میں سے متعدد لکچرار اور پروفیسر ہوئے اور سبکدوش بھی ہو گئے اور کچھ ابھی تک ملک کے مختلف کالجوں اور یونیورسیٹیوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مرحوم کے شاگرد عموماً دو طرح کے تھے۔ پہلی قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو کالجوں میں ان کے درس میں شامل تھے اور دوسرے وہ جنہوں نے پروفیسر موصوف کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کیا۔ ایک اندازے کے مطابق ان کے ایسے شاگردوں کی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے۔

پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری کی علمی شخصیت فارسی زبان و ادب میں تدریس کے علاوہ تصنیف وتالیف اور تحقیق کے نقطہ نظر سے بھی مختلف الجہات تھی۔ وہ فارسی زبان وادب کے مستند اساتذہ میں تھے اور اکثر بڑے بڑے علمی سمیناروں میں انہیں مقالہ خوانی کے لئے بصد احترام مدعو کیا جاتا تھا۔

ادارہ تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ کے زیر تمام ۲۰۱۳ء میں ''سہم سخنوران زن در زبان وادبیات فارسی'' (فارسی زبان وادب میں خواتین کا حصہ) کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد ہوا تھا جس میں غلام مجتبیٰ انصاری صاحب نے فارسی زبان میں اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا تھا اور موضوع کا مکمل احاطہ کر لیا تھا، پھر ادارہ تحقیقات عربی وفارسی پٹنہ کے زیر اہتمام ۲۰۱۵ء میں ایک سیمینار منعقد ہوا جس میں موصوف نے ''فردوسی و شاہنامہ او'' کے عنوان پر مقالہ پڑھا تھا۔ اس مقالے میں شاہنامہ کے مشتملات کے علاوہ فردوسی کے فکر وفن کا تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ پروفیسر موصوف کا مقالہ ''عمر خیام و رباعیات او'' ادارہ تحقیقات عربی و فارسی کے علمی سمینار ۲۰۱۶ء میں پڑھا گیا تھا۔ اس میں مقالہ نگار نے حسب موضوع عمر خیام کی شخصیت اور ان کی رباعیات پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ اپنی تحقیقی نوعیت کے اعتبار سے یہ مقالہ منفرد اہمیت کا حامل ہے۔

مذکورہ تینوں سیمیناروں میں تینوں مقالوں کی ایک اہم خصوصیت یہ رہی کہ یہ تمام مقالے فارسی زبان میں تھے جب کہ موجودہ صدی میں فارسی سیمیناروں میں بالکلیہ طور پر اردو میں مقالے لکھنے کی روایت عام ہو چکی ہے۔ ایسے قحط الرجال کے دور میں فارسی زبان میں مقالہ لکھنا ایک ادبی جسارت سے کم نہیں۔ ملک گیر پیمانے پر اگر دیکھا جائے تو فارسی کے سیمیناروں میں فارسی زبان میں مقالہ لکھنے والے شاذ ونادر ہی نظر آتے ہیں۔ مذکورہ سیمیناروں میں مجتبیٰ انصاری صاحب کی شرکت میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ موصوف نے اپنی طویل تدریسی اور تحقیقی زندگی میں پچاسوں ملک گیر سیمینار میں شرکت کیا، لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ موصوف کے تمام مقالات اور تصانیف کے بارے میں از سر نو تحقیق کی جائے تا کہ موصوف کی علمی خدمات کا احاطہ ہو سکے۔

سیمیناروں میں شرکت کے علاوہ پروفیسر غلام مجتبیٰ انصاری صاحب نے غیر ملکی اسفار بھی کئے۔ ۱۹۹۰ء میں یو۔ جی۔ سی۔ سے انہیں ایک پروجیکٹ ملا تھا جس کا عنوان ''ہندوستان کی فارسی شاعری میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کی ایک جھلک'' تھا۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل کے لئے مواد کی فراہمی کی غرض سے موصوف نے انگلینڈ کا سفر کیا اور پروجیکٹ کو کامیابی تک پہنچا کر یو۔ جی۔ سی۔ کو پیش کیا۔

دوسرا غیر ملکی سفر پروفیسر مجتبیٰ انصاری نے ۱۹۹۴ء میں کیا اور حکومت ایران کی دعوت پر ایران تشریف لے گئے اور وہاں تقریباً ایک ماہ تک قیام کیا۔ اس قیام کے دوران موصوف نے وہاں کے تاریخی آثار، مذہبی مقامات اور تعلیمی اداروں کا دورہ کرنے کے علاوہ ایرانی اساتذہ

اوردانشوروں سے استفادہ بھی کیا۔موصوف کا منظوم سفرنامہ ''مشاہدات مجتبٰی ازسفرایران''اسی سفر کی یادگار ہے۔

جناب مجتبٰی انصاری کی تصانیف اور مقالات کوملکی وغیرملکی پیمانے پر نہ صرف قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، بلکہ ان کے علمی کارناموں کا اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔موصوف کی مجموعی علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں ۲۰۰۱ء میں صدرجمہوریہ ہند ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔

غلام مجتبٰی انصاری نے نہ صرف متنوع علمی وادبی موضوعات پر مضامین ومقالات پیش کئے ہیں اور تنقیدی وتحقیقی تصانیف کے میدان میں ایسی نمایاں خدمات انجام دی ہیں جن سے موصوف کی تنقیدی بصیرت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے، بلکہ اب تک ان کی گیارہ کتابیں بھی تحقیق وتنقید کے موضوع پر شائع ہوکرارباب ذوق سے دادوتحسین حاصل کرچکی ہیں اور تقریباً ۳۵ تحقیقی مقالے بھی ہندوایران کے معتبر رسالوں میں اشاعت پذیر ہوچکے ہیں۔اب تک کی تلاش وجستجو سے جو کتابیں دستیاب ہوئی ہیں، ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱) سید قاسم حاجی پوری: ایک تحقیقی وتنقیدی مطالعہ
(۲) جدید لغت فارسی
(۳) فرہنگ فارسی جدید
(۴) حکیم شیخ حسین شہرتؔ شیرازی: احول وآثار
(۵) فخرالملک عبدالقیوم انصاری: احوال وآثار
(۶) عبدالقیوم انصاری: شخصیت وکارنامے
(۷) لعل وگہر حصہ اوّل (نصابی کتاب)
(۸) لعل وگہر حصہ دوم (نصابی کتاب)
(۹) دیوان حکیم شیخ حسین شہرتؔ شیرازی (تحقیق)
(۱۰) مشاہدات مجتبٰی ازسفرایران، ہمراہ ہشت مقالہ
(۱۱) درویش حسین والہ ہروی: حیات وخدمات

فارسی زبان وادب کی تہذیبی روایت ہزاروں سال پر محیط ہے۔ظاہر ہے کہ فارسی داں حضرات پر ان تہذیبی روایات کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔مجتبٰی انصاری صاحب کی زندگی پر بھی ان تہذیبی روایات کا اثر پورے طور پر حاوی رہا۔اپنے انداز گفتگو، طرز حیات اورنشست وبرخاست میں پورے طور پر وہ ایک سنجیدہ اور مہذب انسان تھے۔علاوہ ازیں ان کے خاندانی و مذہبی پس منظر نے بھی ان کی شخصیت کو مذہب اور تہذیب کا ایک عمدہ نمونہ بنادیا تھا۔ ❀❀

تازہ نگارشات مطلوب ھیں

اکادمی مجلّہ ''زبان وادب'' کے لئے قلم کار حضرات شعری ونثری صنف ادب پر اپنی غیرمطبوعہ اور غیرنشرشدہ، تازہ ترین تخلیقات ہمیں ارسال کریں۔آپ کی معیاری ادبی وتنقیدی اور تحقیقی وتخلیقی نگارشات کے ساتھ ساتھ آپ کی ایسی تخلیقات کا بھی ہمیں خصوصیت سے انتظار ہے جو اصناف ادب کی تاریخ، اس کے فن پر ہوں اور مقابلہ جاتی امتحانات کے طلبا وطالبات کے لئے مفید مطالعہ ہوں۔ہمیں بچوں کے لئے بھی نثری وشعری تخلیقات خصوصاً مختصر مضامین، کہانیاں اور نظمیں مطلوب ہیں۔تخلیقات کے ساتھ اپنی تصویریں بھی ارسال کریں۔نگارشات صفحہ کے ایک طرف، املا وانشا کی غلطیوں سے پاک صاف اور خوش خط لکھی ہوئی ہوں یاصحت وصفائی کے ساتھ کمپوز شدہ ہوں۔ساتھ ہی نام، مکمل پتہ اردو اور انگریزی میں، ڈاکخانہ کا پن کوڈ، اپنے موبائیل کا نمبر بھی لکھیں اور بینک کھاتہ جس نام سے ہے وہ نام، اکاؤنٹ نمبر، آئی ایف کوڈ بھی لکھیں۔تخلیقات کے ساتھ ''غیرمطبوعہ غیرنشرشدہ خاص برائے: زبان وادب'' لکھنا بھی نہ بھولیں۔تخلیقات کی اشاعت کے سلسلے میں مدیر کا فیصلہ حتمی ہوگا۔تخلیق کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، زیراکس یا فوٹو اسٹیٹ کاپی نہ بھیجیں۔

مدیر / معاون مدیر "زبان وادب" اردو بھون، چوھٹہ، اشوک راج پتھ، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴

امام الدین امامؔ

Research Scholar, Deptt. of Urdu, Faculty of Arts, University of Delhi, Delhi (Mob. 6206143783)

میرؔ کی غربت اور قنوطیت کا قضیہ

میرتقی میرؔ اُردو شاعری میں ایک اہم مقام و مرتبہ رکھتے ہیں۔ میرؔ کی شخصیت اور ان کے حالات کے بارے میں اگر چہ بہت ساری باتیں جو متقدمین نے اپنے تذکروں میں لکھا ہے، وہی عموماً بار بار روایتی انداز سے تادیر دہرائی جاتی رہیں، البتہ بعد کے محققین مثلاً قاضی عبدالودود اور دیگر اہل بینش نے ان باتوں کی مدلل انداز میں تردید کی ہے۔ مثلاً میرتقی میرؔ کا لکھنؤ جاکر شعر کہنا اور مشاعرے میں شرکت کر کے خود اپنے اشعار سے اپنا تعارف پیش کرنا، میرؔ اور خان آرزوؔ کی نااتفاقی اور خان آرزوؔ کو کمتر دکھانا اور میرؔ کی معصومیت، میرؔ کے والد کا اپنے زمانے کا بزرگ صوفی ہونا، میرؔ کے سوتیلے بھائی کا ان کو پریشان کرنا، میرؔ کی مفلسی و قلاشی کا ذکر، میرؔ کی شاعری کے اوپر یاس و محرومی کا ٹھپہ لگا دینا، میرؔ کی شاعری میں بہتر نشتر کا ہونا، حالاں کہ اس حوالے سے اب تک کوئی ایسی تحقیق سامنے نہیں آئی ہے جن میں بہتر (۷۲) نشتر موجود ہوں۔ ایک روایت چلی آرہی ہے کہ حسرتؔ موہانی نے میرؔ کے بہترین بہتر (۷۲) اشعار کا ایک انتخاب ''اردوئے معلیٰ'' میں شائع کیا تھا۔ اُسے ہی ''بہتر نشتر'' کہتے ہیں، لیکن اب تک وہ رسالہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔ ہاں! ۵۶ صفحے کا ایک کتابچہ ''میرؔ کے نشتر'' کے نام سے ضرور موجود ہے، جس کے مصنف مسعودالرحمٰن خاں ندوی ہیں اور اس کا سال اشاعت ۱۹۳۰ء ہے۔ اس میں اشعار پیش کئے گئے ہیں، لیکن مسعودالرحمٰن خان ندوی نے الگ الگ نشتروں کی فہرست نہیں پیش کی ہے۔ ان جیسی درجنوں باتیں ایسی ہیں جو آج تک روایتاً چلی آرہی ہیں، چنانچہ میرؔ کی شخصیت اور ان کی شاعری پر انہیں چند باتوں کے حوالے سے میں اپنی رائے اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

''ذکر میرؔ'' سے ثابت ہوتا ہے کہ میرؔ کے والد کا نام محمد علی اور لقب محمد متقی تھا۔ یہ لقب کسی نے دیا نہیں تھا، اس کی صحت میں قاضی عبدالودود جیسے محقق کو شبہ ہے۔ میرؔ، خان آرزوؔ کی بہن کے سوتیلے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم آگرے میں ہوئی، لیکن اس کے علاوہ سب کچھ دہلی میں سیکھا، شعر کہنے کا شوق میرؔ کو سعادتؔ امروہوی نے دلایا۔ دہلی میں ان کا قیام کم از کم چالیس سال رہا۔ اکبرآباد میں بارہ تیرہ سال اور لکھنؤ میں اٹھائیس سال۔

میرؔ نے غربت و مفلسی کا ذکر اپنی شاعری میں جگہ جگہ کیا ہے، لیکن سمجھ نہیں آتا کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟ میرؔ کی ہی بات کو بعد کے اکثر ادیب و ناقد نے سچ مان کر تحریر میں لے لیا جن میں نثار احمد فاروقی اور مولوی عبدالحق وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے، جب کہ یہ بات سچ معلوم نہیں ہوتی اور یہ کہنا بھی مبالغہ معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ نے جتنی محرومیاں اور مصیبتیں جھیلیں ہیں، اتنی محرومی اردو کے کسی دوسرے شاعر نے نہیں جھیلی۔ بقول ڈاکٹر خوشحال زیدی:

> ''والد کے مرنے کے بعد میرؔ نے جتنی پریشانیاں اور مصیبتیں اٹھائی ہیں شاید اردو کے کسی دوسرے شاعر نے نہ اٹھائی ہوں گی۔ خود ان کے رفیق اور رشتہ داروں نے بے التفاتی اپنائی۔'' (اردو زبان وادب کا خاکہ، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ادارہ بزم خضر راہ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۹۹۳ء، ص ۲۵۸)

جب تک میرؔ کے والد زندہ رہے تو انہوں نے سارا خرچ برداشت کیا۔ والد کے مرنے کے فوراً بعد میرؔ کی رسائی صمصام الدولہ تک ہوجاتی ہے اور ان کے لئے ایک روپیہ روزینہ مقرر کردیا جاتا ہے جو صمصام الدولہ کی وفات یعنی ۱۷۳۹ء تک ملتا رہا۔ (ص ۵ تا ص ۶) اس کے بعد میرؔ خان آرزوؔ کے یہاں رہے۔ خان آرزوؔ کے بارے میں ''نکات الشعرا'' میں

میر لکھتے ہیں کہ ''استاد و پیرومرشد بندہ''، لیکن بعد میں بگاڑ ہوا، جس کی ایک الگ تفصیل ہے، جس کی طرف جانے کا یہ موقع نہیں۔

جب خان آرزو کے یہاں سے گئے تو راستے میں حوض قاضی میں ایک شخص سے ملاقات ہوئی اور وہ انہیں رعایت خاں پسر ظہیرالدولہ عظیم اللہ خاں و خواہر زادۂ قمرالدین خاں وزیر کے یہاں لے گیا۔ رعایت خاں نے میر کو اپنا رفیق بنالیا اور اس طرح انہیں ''قید تنگ دستی'' سے رہائی ملی۔ یہ سلسلہ ۱۷۴۸ء یعنی قمرالدین خاں کی موت تک چلتا رہا۔ میر رعایت خاں جو قمرالدین خاں کے وزیر تھے، ان کے ساتھ رہے (ص ۷) اس کے بعد رعایت خاں دہلی پہنچ کر راجہ بخت سنگھ سے منسلک ہوگئے۔ میر بھی ان کے ساتھ تھے، ان دونوں کو راجہ بخت سنگھ راجپوتانہ اپنے ساتھ لے گئے، کچھ عرصہ بعد رعایت خاں اور راجہ بخت سنگھ کی نہیں بنی جس کے بعد دونوں الگ ہوگئے، میر نے رعایت خاں کی طرف سے قسم بھی کھائی، لیکن صلح نہ ہوسکی، پھر کچھ معاملات ہوئے اور میر نے رعایت خاں سے الگ ہوکر ''خانہ نشینی'' اختیار کرلی۔

رعایت خان نے رفاقت کا خیال کرکے میر کے بھائی محمد رضی کو نوکری پر رکھ لیا۔ ابھی کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میر نے جاوید خاں خواجہ سرا کے یہاں نوکری کرلی۔ یہاں بھی میر کو نام کا سپاہی رکھا گیا، کوئی خاص محنت و مشقت کا کام ان سے نہیں لیا جاتا تھا۔ قائم خاں کے قتل ہونے کے بعد میر تقی میر نجم الدولہ اور شجاع الدولہ کے ساتھ ان کا گھر ضبط کرنے گئے، لیکن جنگ میں صفدر جنگ کو شکست ہوئی اور نجم الدولہ مقتول ہوئے۔ میر شکست خوردہ لشکر کے ساتھ دہلی واپس لوٹ آئے۔ اس کے بعد میر بیکار ہوگئے، پھر مہانرائن دیوان صفدر جنگ نے اپنے داروغہ دیوان خانہ نجم الدین علی سلام کی معرفت میر کو کچھ امداد بھیجا اور طلب کیا، چنانچہ میر کے پھر کچھ مہینے فراغت میں گزرے۔ (ص ۸) یہ وہ زمانہ تھا جب تک صفدر جنگ بقید حیات تھے۔ یعنی اکتوبر ۱۷۵۴ء تک میر صفدر جنگ کے دیوان مہانرائن سے وابستہ تھے۔ اس کے بعد یعنی ۱۱۶۹ہجری مطابق ۱۷۵۶ء کو پھر راجا جگل کشور میر تقی میر کو اپنے ساتھ لے گئے اور اپنے اشعار اصلاح کے لئے پیش کئے۔ اس حوالے سے میر ''ذکر میر'' مرتبہ نثار احمد فاروقی میں لکھتے ہیں ''اِصلاح ندیدم بر اکثر تصنیفات او خط کشیدم'' (ص ۱۰) پھر راجا جگل کشور کے توسط سے ہی میر راجا ناگرمل کے یہاں نوکر ہوئے۔ اس کے بعد درّانی کے حملے کے بعد اہل وعیال کو لے کر نکلے تو راستے میں راجا جگل کشور کی بیوی ملی، وہ میر کو اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئی، پھر میر کمبھیر پہنچے، جہاں راجا سورج مل نے اپنے قلعے میں ٹھہرایا۔

اس واقعے سے قبل میر کی شادی ہوچکی تھی اور ان کے ساتھ ان کا لڑکا فیض علی بھی تھا۔ اس کے بعد پھر میر کو راجا ناگرمل مرہٹوں کی شکست کے بعد ساتھ لے کر دہلی پہنچے، پھر جب سورج مل نے ۱۷۶۱ء میں آگرہ پر قبضہ کرلیا تو وہاں ناگرمل کو بھی بلالیا، اس کے ساتھ میر بھی تھے۔

اسی سفر کے دوران میر نے علی متقی اور امان اللہ (والد اور رشتے کے چچا) کے مزاروں کی زیارت کی تھی۔ اس کے بعد پھر جب راجا ناگرمل دوسری دفعہ آگرہ گئے تو پھر میر ان کے ساتھ تھے۔ (ص ۱۱)

جب راجا ناگرمل کی موت ہوگئی تو میر نے ان کے بیٹے رائے بہادر سنگھ سے مل کر اپنی حقیقت حال بیان کی۔ رائے بہادر سنگھ نے اپنی بساط بھر میر کے ساتھ اچھا سلوک کیا۔

اس کے بعد میر واپس دہلی چلے آئے وہاں سودا، سوز موجود نہ تھے درد، مظہر اور حاتم تھے۔ اسی زمانے میں میر نے مثنوی ''اژدرنامہ'' (اجگر نامہ) لکھی اور معاصرین کو حشرات الارض قرار دیا۔ اسی مثنوی کے جواب میں شاہ حاتم کے شاگرد میر امان اللہ نثار نے یہ شعر کہا تھا (ص ۱۲) جس کو ''آبِ حیات'' میں مولانا محمد حسین آزاد نے بھی نقل کیا ہے ؎

حیدر کرار نے وہ زور بخشا ہے نثار
ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلے چیر کر

اس کے بعد ۱۱۹۵ھ مطابق ۸۱-۱۷۸۰ء میں میر کو آصف الدولہ نے لکھنؤ بلانے کی خواہش اپنے ماموں سالار جنگ سے ظاہر کی۔ انہوں نے اخراجات سفر بھیجنے کی تجویز رکھی۔ ایک خط کے ساتھ زادِراہ میر کو بھیجا گیا، چنانچہ میر وہاں سے فوراً چل نکلے۔ (ص ۱۳) یہ بات ۱۱۹۶ہجری کی ہے۔ یعنی ۱۷۸۱ء سے وفات تک میر لکھنؤ میں رہے۔

مذکورہ بیانات سے ظاہر ہے میر نے راجا ناگرمل کی موت کے بعد اور لکھنؤ آنے سے پہلے کی زندگی ہی کسمپرسی میں گزاری ہے۔ بقیہ زندگی

انہوں نے فراغت میں گزاری، اس کے باوجود میرؔ نے اپنی شاعری میں مفلسی و قلاشی کا ذکر خوب کیا ہے اور اسی سے متاثر ہو کر بعد والوں نے میرؔ کی غربت کا رونا رویا ہے۔ مذکوہ تمام حوالے جن کے سامنے صرف صفحہ نمبر لکھے گئے ہیں وہ کتاب (میرؔ، از قاضی عبدالودود شائع کردہ، خدابخش لائبریری، پٹنہ،۱۹۸۴ء) سے لئے گئے ہیں۔

میرؔ کی شاعرانہ عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مرورایام کے ساتھ ساتھ ان کی شہرت اور مقبولیت میں تبدریج اضافہ ہی ہوتا جارہا ہے اور اس حوالے سے بہت سارے گمشدہ گوشے سامنے آرہے ہیں۔ اس کا اندازہ ماضی قریب کی دو اہم کتابوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ پہلی کتاب شمس الرحمٰن فاروقی کی ''شعر شور انگیز'' اور دوسری کتاب پروفیسر احمد محفوظ کی ''بیان میرؔ'' ہے۔ یہ دونوں کتابیں میرؔ فہمی میں نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ ''آب حیات'' مؤلفہ مولانا محمد حسین آزاد میں درج ہے کہ ''میر تقی میرؔ دلی سے لکھنؤ گئے، پھر معلوم ہوا کہ مشاعرہ ہے تو شعر لکھا اور مشاعرے میں شرکت کی، لوگ ان کے وضع قدیمانہ کو دیکھ کر ہنسنے لگے پھر میرؔ نے تین شعر ''کیا بود باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!'' میں اپنا تعارف پیش کرایا، تب جا کر لوگوں نے پہچانا اور بعد میں آصف الدولہ تک یہ بات پہنچی تو ان کے لئے دوسو روپیہ مہیا کر دیا۔'' آزاد کی یہ پوری بات بالکل ویسی ہی گپ ہے جیسا کہ شبلی نے آزادؔ کے بارے میں گپ کو وحی معلوم ہونے کی بات کہی تھی۔ محمد حسین آزاد یا ان کے علاوہ جن لوگوں نے ان واقعات کو نقل کیا ہے۔ اس حوالے سے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''آزادؔ نے جو حکایتیں میرؔ و آصف الدولہ سے متعلق بیان کی ہیں، وہ ایسے لوگوں کے بیانات ہیں جنہوں نے آصف الدولہ کا زمانہ نہیں پایا۔'' (میرؔ، از قاضی عبدالودود، خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ،۱۹۸۴ء، ص۱۴)

قاضی عبدالودود ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو! پڑھنے کا حال لکھا ہے۔ یہ بھی قابل قبول نہیں۔ ۱۱۹۶ھ میں میرؔ اردو کے بزرگ ترین زندہ شاعر بالاتفاق تسلیم کئے جاتے تھے اور ان کی شہرت عرض وطولِ ہند میں پھیلی ہوئی تھی۔ میرؔ فرماں روئے اودھ کے بلائے ہوئے اودھ گئے تھے، یہ ممکن نہیں کہ لوگوں کو اس کی خبر نہ ہو، میرؔ سا شاعر مشاعرے میں بانیانِ مشاعرہ کے اصرار کے بغیر شریک ہو، ممکن نہیں۔'' (میرؔ، از قاضی عبدالودود، ص۳۰)

محمد حسین آزاد کی ہی بات کو رسالہ ''ندیم'' اپریل ۱۹۳۶ء کے شمارے میں خواجہ عشرتؔ لکھنوی نے درج کیا ہے۔ ان دونوں حضرات کے حوالے سے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''یہ غلط ہے کہ میرؔ نے لکھنؤ جانے کے حالات نظم کئے ہیں اور وہاں پہنچتے ہی شریک مشاعرہ ہوئے۔''
>
> (رسالہ ''معیار''، مئی، ۱۹۳۶ء، ص۲۳۲)

بلکہ یہاں یہ بات بھی غلط ہے کہ بادشاہ کو بعد میں خبر ملی۔ حقیقت یہ ہے کہ میر تقی میرؔ نواب آصف الدولہ کی دعوت پر ہی دہلی سے لکھنؤ گئے تھے، جس کا ذکر گزشتہ سطور میں ہو چکا ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرؔ یا دنیا کے کسی بھی انسان کی خود کی رائے کو بنا کسی لاگ لپیٹ کے من وعن قبول کر لینا انصاف کے خلاف ہے اور عقل بھی اس بات کو تسلیم کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ چنانچہ میرؔ کے بیان کے حوالے سے آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

> ''میرؔ کے سارے بیانات کو بے چوں چرا تسلیم کر لینا جیسا کہ خواجہ احمد فاروقی نے کیا ہے، درست نہیں معلوم ہوتا، میرؔ نے اپنے والد کی بزرگی کا جو تذکرہ کیا ہے اِسی پر اکتفا کر کے میرؔ کے بچپن کی تصویر کھینچنا، ہمارے عام نظامِ اخلاق کے مطابق ہوتو ہو لیکن ادبی تحقیق کا تقاضا کچھ اور ہے۔ ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرؔ نے جو کچھ کہا ہے وہ سرتا سر جھوٹ ہے۔'' (مسرت سے بصیرت تک، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ص۱۲ اوص۱۳)

اسی طرح ''ذکر میر'' کی تحریروں کے حوالے سے قاضی عبدالودود لکھتے ہیں:

> ''انہوں نے اپنی ذات، اپنے بزرگوں اور اپنے مخالفین کی نسبت جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ لازماً قابل قبول نہیں۔''
>
> (میرؔ، از قاضی عبدالودود، خدابخش لائبریری، پٹنہ،۱۹۸۴ء، ص۱)

سابقہ بیان کے بعد اگلے صفحے میں آلِ احمد سرور میر تقی میؔر کے ہم نوا بن بیٹھے، یہی وجہ ہے میؔر نے جو اپنے بھائی کے بارے میں لکھا ہے وہ اس کی تائید کرتے نظر آتے ہیں۔انہوں نے بھی لکھا ہے کہ بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا،لیکن میر تقی میؔر کا بھائی کے ساتھ کیسا سلوک تھا، اس کے بارے میں انہوں نے کچھ نہیں لکھا ہے۔خان آؔرزو کے بارے میں سرور صاحب نرم دکھتے ہیں جب کہ اس کے برعکس میؔر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کے بارے میں گرم پڑتے نظر آتے ہیں۔سرور صاحب لکھتے ہیں:

''بھائی نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔خان آؔرزو جیسے سنجیدہ اور ثقہ آدمی کی صحبت ملی،مگر خان آؔرزو کی شفقت انہیں نصیب نہ ہوئی۔قصور خان آؔرزو کا زیادہ ہے یا میؔر کا اس کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی۔'' (مسرت سے بصیرت تک،ص۱۴)

آلِ احمد سرور صاحب کو چاہئے تھا کہ سوتیلے بھائی کے حوالے سے بھی ایسی ہی رائے قائم کرتے کہ زیادہ قصور میؔر کا ہے یا محمد حسن کا،لیکن خان آؔرزو کے بارے میں انہوں نے ایسی کوئی بات نہیں کہی، جب کہ بھائی کو لپیٹ لیا۔ مذکورہ تمام باتوں کی تردید قاضی عبدالودود نے اپنے ماہنامہ ''معیار'' میں کیا ہے۔اس کے بعد قاضی عبدالودود کی کتاب ''میر'' مطبوعہ ۱۹۸۴ء میں بھی اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔ ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بھی اپنی کتاب ''نئے تنقیدی زاویے'' (مطبوعہ ۱۹۷۶ء، ص۱۷۳) میں سوتیلے بھائی کے سوتیلے پن،فتنۂ روزگار، خان آؔرزو سے تربیت نہ کرنے کی گزارش اور دوستی کے پردے میں کام تمام کرنے کی بات کہی ہے۔اس حوالے سے یہ عبارت دیکھئے :

''میرا خیال ہے کہ جو مواد ہمارے پاس ہے وہ اس کے لئے کافی نہیں کہ ہم ڈاکٹر عبدالحق کی طرح اسے ظالم اور میؔر کو مظلوم قرار دیں۔'' (میؔر،از قاضی عبدالودود،ص ۸۵)

قاضی عبدالودود ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''یہ بات کہ محمد حسن نے میؔر کا خاتمہ کرنے کے لئے خان آرزو کو لکھا تھا اوران دونوں میں سازش تھی کہ ایسی صورت پیدا ہو کہ میؔر اس دنیا میں نہ رہیں،صرف میؔر کی شہادت پر باور نہیں کی جاسکتی۔'' (میؔر،از قاضی عبدالودود،ص۱۴۳)

میؔر کی غربت کے تذکرے پر نظر ڈالنے کے ساتھ ساتھ، یہ سوال بھی بجائے خود کم اہم نہیں کہ کیا میؔر واقعی قنوطی تھے؟

شاعری میں رونا،آنسو بہانا،غم کا اظہار،محبوب کی بے اعتنائی وغیرہ کا درد اور کرب اُس پورے عہد و تہذیب کا وطیرہ ہے، جو میؔر کا عہد ہے۔اگر عاشقی میں میؔر روتے روتے سوجاتے ہیں،یا آہستہ بولنے کی تلقین کرتے ہیں تو یہ حال صرف میؔر کا نہیں ہے۔اس وقت مغلیہ حکومت کا شیرازہ بکھر رہا تھا، ہر طرف سے دلی پر حملے ہو رہے تھے۔

میؔر کے یہاں مایوسی اور حرماں نصیبی کی جو کیفیت نظر آتی ہے، اُس کی سب سے بڑی وجہ دہلی کی تباہی ہے۔انسانی زندگی میں درد و غم اور سانسوں کا چلنا لازم و ملزوم ہیں۔اگر کسی شخص کی پوری زندگی میں درد و غم نہیں تو پھر اس کے انسان ہونے میں شک ہے۔اس دعوے کی دلیل کے طور پر غالؔب کا ایک شعر دیکھئے ۔

قید حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

اسی حوالے سے جؔگر مرادآبادی کا یہ شعر دیکھئے ۔

دل گیا ، رونق حیات گئی
غم گیا ، ساری کائنات گئی

پروفیسر علی احمد فاطمی نے ایک جگہ لکھا ہے :

''پوری اردو شاعری بلکہ پوری دنیا کی شاعری میں غم کی لہریں پائی جاتی ہیں۔......غم ہونا یا غمگین ہونا دردمندی اور خستگی کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ضروری نہیں ہے کہ غمگینی، مایوسی اور مریضانہ کیفیت بن جائے۔ غالباً اسی لئے اکثر فارسی غزل گوشعرا نے غم کو دولت غم کے طور پر قبول کیا اور نعمت غم کے طور پر پیش کیا۔''

(سہ ماہی ''ساغر ادب'' جنوری تا مارچ ۲۰۲۴ء)

میؔر کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ درد و غم ان کی شاعری میں غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔وہ خود کہہ گئے ۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میؔر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

لیکن میؔر ساتھ ہی یہ بات بھی کہتے ہیں اور اس بات کا ہم کو احساس دلاتے ہیں کہ وہ صرف درد وغم کے ہی شاعر نہیں ہیں بلکہ ۔

بے خودی پر نہ میؔر کی جاؤ
تم نے دیکھا ہے اور عالم میں

اسی غمگینی، مایوسی اور قنوطیت کے حوالے سے آلِ احمد سرور لکھتے ہیں:

''مگر میؔر کی سادگی، قنوطیت اور جذباتیت کا اتنا ڈھنڈورا پیٹا جا چکا تھا کہ یہ خیالات ادبی تاریخ کا جزو بن گئے۔''

(مسرت سے بصیرت تک، ص ۱۵)

ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ قنوطیت، غم اور مایوسی اردو شاعری کے دبستان دہلی کی خصوصیات میں سے ہیں۔ دوسری بات ، یہ طرز اظہار صرف میؔر کے یہاں نہیں پایا جاتا ہے بلکہ غم اور مایوسی کے اشعار دبستانِ دہلی کے دیگر شعرا کے یہاں بھی موجود ہے۔سوؔدا کے یہاں اگر ''فکر معاش، عشق بتاں اور یاد رفتگاں'' کی بات اور ''گریبان سحر کے سدا کا چاک رہنے'' کا ذکر ہے اور غالبؔ کے یہاں ''غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج'' کی فکر ملتی ہے، مگر اس کے باوجود بھی انہیں ہم راست طریقہ سے قنوطی شاعر نہیں کہتے تو پھر میؔر کے حق میں ایسا کہنے پر اصرار کیوں؟

ڈاکٹر خوشحال زیدی نے بجا طور پر اپنی کتاب میں میر تقی میؔر کے قنوطی ہونے کا رد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''میؔر کو قنوطی کہنا بے سود، بے بنیاد ہے، ان کی شاعری میں انسانیت کی اعلیٰ قدریں موجود ہیں وہ شکست خوردہ نہیں۔'' (اردو زبان وادب کا خاکہ، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ادارہ بزم خضر راہ، جامعہ نگر، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء، ص ۲۵۷)

ایک جگہ اور بھی میؔر کی قنوطیت کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کرنے کے بعد ڈاکٹر خوشحال زیدی نے میؔر کے قنوطی نہ ہونے کی بات کہی ہے۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ان کی کتاب ''نئے تنقیدی زاویے'' (مطبوعہ ۱۹۷۶ء، ص ۱۶۹) پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ ہر شاعر کے کچھ الفاظ پسندیدہ ہوتے ہیں اور وہ اپنی شاعری میں موقع ومناسبت کے اعتبار سے ان کا بار بار استعمال کرتا ہے، جن کو اس شاعر کی اصطلاح یا ترکیب کہہ سکتے ہیں۔ میؔر کے یہاں بھی ایسا ہے، مگر اس کی بنیاد پر میؔر کو قنوطی شاعر کہنا کسی بھی لحاظ سے مناسب نہیں۔ حد تو یہ ہے کہ میؔر کے دیوان کی اگر خاص توجہ سے ورق گردانی ہو تو اس میں ایسے اشعار کا مل جانا بھی محال نہیں جو میؔر کی نشاطیہ شاعری کا حوالہ بنیں گے۔ آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''ہر شاعر کی طرح میؔر کے یہاں بھی بعض اصطلاحات اور ترکیبیں بار بار آتی ہیں۔ دِوانہ، لہو، جنوں، دلِ پر خوں، آزار جیسے الفاظ کی تکرار بھی کچھ معنی رکھتی ہے۔''

(مسرت سے بصیرت تک، ص ۲۷)

قاضی عبدالودود کے معروف تحقیقی رسالہ ''معیار'' میں درج ہے کہ:

''میؔر وسوؔدا کے دور میں تین رجحانات بہت نمایاں ہیں، 'یاسیت' تصوف، اپج اور جدت طرازی کرنے کے بجائے سارا زور ابتذال اور تصنع میں خرچ ہونے لگا۔''

(معیار، مارچ، ۱۹۳۶ء، ص ۹۷)

میر تقی میؔر اتنی آسانی سے مایوس ہونے والے انسان نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ زندگی میں نئی امید کے متلاشی نظر آتے ہیں۔ درد وغم جو انسانی زندگی کا اہم حصہ ہے اس کا احساس ہوتے ہی فوراً ہمت اور حوصلے کو مضبوط کر کے بہتری کی تلاش میں نکل پڑتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

اب رنج و درد و غم کا پہنچا ہے کام جاں تک
پر حوصلے سے شکوہ آیا نہیں زباں تک

میؔر کی شاعری میں قنوطیت کی تردید میں میر تقی میؔر کا ہی ایک شعر نقل کرتا ہوں، ملاحظہ فرمائیں ۔

خوش رہا جب تک رہا جیتا
میؔر معلوم ہے قلندر تھا

❀❀❀

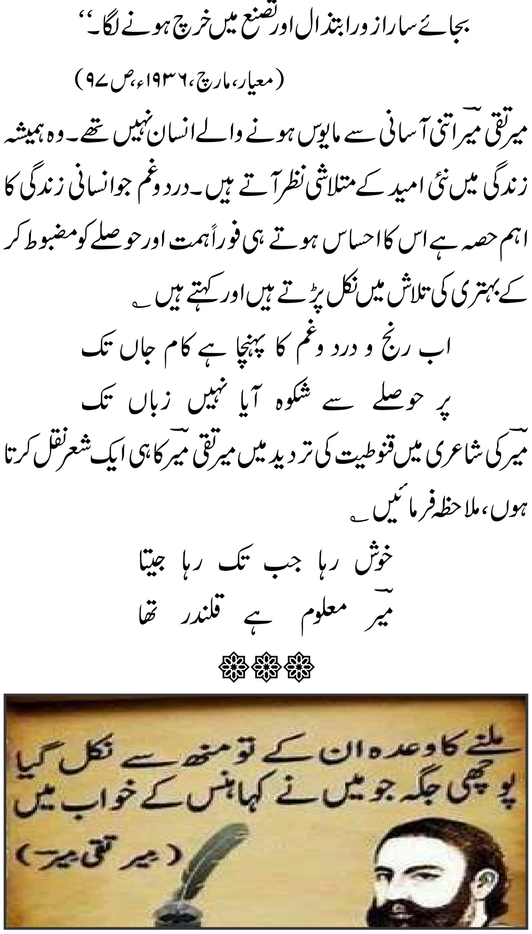

یادیں

نثاراحمد صدیقی

Muslimabad, Near Gowardhan, Maidan, Haspura-824120 (Mob.9546308801)

کلام حیدری

کلام حیدری سے میری پہلی سرسری ملاقات ''بک امپوریم'' سبزی باغ میں ہوئی۔ ان کے شامل اس وقت سہیل عظیم آبادی، رفیع احمد اور غلام سرور تھے۔ میرا تعارف علی حیدر ملک نے ہی کلام حیدری سے کرایا تھا۔ ویسے میں ان کے نام سے واقف تھا، کیوں کہ جب بھی اورنگ آباد (بہار) کے ''ظہوریہ ہوٹل'' یا ''جعفریہ ہوٹل'' میں یاران ادب یکجا ہوتے تو اس وقت کسی ادبی رسالے یا کسی صنف ادب پر گفتگو میں سہیل عظیم آبادی، غیاث احمد گدی، کلام حیدری اور انور عظیم کا ذکر ضرور ہوتا تھا، اس لیے میرا کلام حیدری سے غائبانہ تعارف تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ میں نے انہیں ''بک امپوریم'' میں جیتے جاگتے انسانی پیکر میں دیکھا۔

اس ملاقات میں بس رسمی باتیں ہوئیں اور انہوں نے مجھے گیا ''ریناہاؤس'' میں آنے کی دعوت دی، لیکن میں ان سے تقریباً پانچ سال دور ہی دور رہا۔ جب میں پٹنہ سے ٹریننگ کے لیے بھرکنڈہ (جھارکنڈ) پہنچا تو وہاں ظہیر نیازی سے ملاقات ہوئی۔ اس زمانہ میں اردو ڈائجسٹ کافی تعداد میں ہندو پاک سے نکل رہے تھے۔ ان رسالوں میں ظہیر نیازی کی تخلیقات اکثر شائع ہوتی تھیں۔

یہ اتفاق ہے کہ ظہیر نیازی ہمارے آبائی وطن (ڈِہری اون سون ضلع روہتاس) کے ایک گاؤں کے رہنے والے تھے اور میرے والد (عبدالرشید) صاحب سے بہت قریب تھے۔ دراصل یہ دونوں این۔سی۔ڈی۔سی (کول فیلڈ) کے الگ الگ سیکشن میں کام کر رہے تھے۔ اس بنیاد پر ہم دونوں بہت قریب ہوئے اور گاہے گاہے فرصت کے اوقات میں ادبی خیالات کا تبادلہ کرتے رہے۔

جب میں بھرکندہ ایم۔ٹی۔ایس (مائننگ ٹریننگ اسکول) سے ٹریننگ حاصل کر کے اپنے شہر آیا تو چند ماہ بعد میری شادی کلام حیدری کے شہر گیا کے محلّہ گیوال بیگہ میں سید سعید صاحب کی صاحبزادی سیدہ رشیدہ خاتون سے ہوگئی۔ اس شادی میں ظہیر غازی پوری، ش۔م۔دامن، جمال الدین ساحل اور صابر حسین خاں ڈالڈا (جو بعد میں ایڈوکیٹ بنے اور اورنگ آباد کورٹ میں مشہور و معروف ہوئے) نے شریک ہو کر تعریف کے حسن کو دوبالا کیا۔ شادی کے بعد گیا شہر میں آمد و رفت کا سلسلہ چلتا رہا، لیکن میں نے کبھی بھی ''رینہ ہاؤس'' جا کر کلام حیدری سے ملاقات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

دراصل کلام حیدری معمولی انسان کا نام نہیں تھا۔ وہ افسانوی ادب میں بلند مقام کے ساتھ ایک کمپنی (جنتا ہیوم پائپ فیکٹری) کے مالک بھی تھے۔ ان کا رعب مجھ پر طاری تھا۔

میری شادی کے دو سال بعد اتفاق سے اسمبلی الیکشن ہونے والا تھا۔ اس الیکشن میں ستندر نرائن سنگھ ابن انوگرہ نرائن سنگھ اورنگ آباد حلقہ سے انتخاب لڑ رہے تھے۔ اسی موقع پر ستندر نرائن سنگھ کے ساتھ کلام حیدری اور مختار خاں (جنتا ہیوم پائپ کمپنی کے منیجر) بھی اورنگ آباد ڈاک بنگلہ میں تشریف لائے تو میرے خالو جان محسن رضا، میرے والد عبدالرشید، فضل خاں، نثار خاں عرف بنگالی خاں، ڈاکٹر نہال احمد، ایڈوکٹ سرجو بابو، سہیل احمد انصاری، مہیش سنگھ اور شہر کے کئی معزز حضرات کے ساتھ ش۔م۔دامن اور راقم الحروف اورنگ آباد ڈاک بنگلہ میں خصوصی طور پر کلام حیدری سے ملنے کے لئے پہنچے۔ وہاں کافی سیاسی لوگوں کی بھیڑ دیکھنے کو ملی۔ یہ لوگ ستندر نرائن سنگھ سے مل کر الیکشن سے متعلق تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ ستندر نرائن سنگھ نے شہر کے چند معزز حضرات کو ڈاک بنگلہ کے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔ اسی درمیان ڈاک بنگلہ کے خانساماں پر ش۔م۔دامن کی نظر پڑی، اتفاق سے خانساماں اپنے محلے کے تھے۔ ش۔م۔دامن نے انہیں کلام حیدری سے ملنے کی بات کہی تو انہوں نے بتایا کہ:

''آپ دونوں اپنا نام لکھ کر رقعہ دیجئے میں ان تک پہنچا دوں گا، ملنا نہ ملنا ان کی مرضی پر ہے۔''

ش۔م۔دامن نے فوراً ایک کاغذ پر دونوں کا نام لکھ بھیجا۔ وہ رقعہ کلام حیدری صاحب کے ہاتھوں میں جیسے ہی پہنچا، وہ فوراً باہر نکل آئے۔ ہم دونوں نے انہیں سلام کیا تو وہ ڈاک بنگلہ کے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ باتوں کے درمیان انہوں نے بتایا کہ ''آپ دونوں کے نام سے میں اچھی طرح واقف ہوں (میری طرف اشارہ کرتے ہوئے) نثار احمد صدیقی کے مضامین تو ہمارے ہفتہ وار 'مورچہ' میں برابر شائع ہوتے رہے ہیں۔ 'ظہیر صدیقی: ایک جائزہ' مضمون شائع ہونے پر نثار مصطفیٰ، شاکر خلیق، ظہیر صدیقی و علی حیدر ملک گروپ میں قلمی جنگ بہت دنوں تک ہوتی رہی اور یہ ادبی جنگ ہاتھا پائی تک پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی۔ نثار صاحب میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

میں نے مختصر جواب دیا: ''جی ہاں......!''

''دامن صاحب آپ کی کئی ہفتہ سے کوئی شعری تخلیق برائے اشاعت 'مورچہ' میں نہیں آئی ہے، ایسا کیوں؟''

دامن صاحب نے جواب دینے کے بجائے چار غزلیں و نظمیں کلام حیدری کے ہاتھوں میں دے دیا۔

کلام حیدری صاحب نے ان شعری تخالیق کو سرسری نظر سے دیکھا اور پاکٹ میں رکھ لیا۔ تھوڑی دیر تک علی حیدر ملک اور تبسم شفائی سے متعلق باتیں ہوتی رہیں۔ اسی درمیان ایک طشت میں چائے بسکٹ آ گئے۔ ہم تینوں چائے بسکٹ سے لطف اندوز ہونے لگے کہ اسی وقت ستندر نرائن سنگھ نے کلام حیدری کو بلوا بھیجا۔ کلام حیدری اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دونوں سے کہا:

''آپ دونوں 'رینہ ہاؤس' گیا آیئے تاکہ ادب سے متعلق تفصیلی گفتگو ہو سکے۔ میری جانب دیکھتے ہوئے مزید کہا:

''جناب آپ کی اب تو گیا سسرال ہو گئی پھر ایسی بے رخی کیوں؟'' پھر ستندر نرائن سنگھ کے کمرے میں چلے گئے۔ یہ میری دوسری ملاقات تھی۔

کلام حیدری جیسے مخلص انسان بہت ہی کم نظر آئے۔ ان کے اندر جو پیار و محبت دیکھنے کو ملی وہ ایک بڑا ادیب بننے میں یقیناً معاون ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سہیل عظیم آبادی کے بعد کلام حیدری اور غیاث احمد گدی کا نام ہندو پاک کے اردو فکشن میں بلند مرتبہ رکھتا ہے جسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد جب بھی گیا جانا ہوا، میں ''رینہ ہاؤس'' کی بجائے معروف گنج آفس جاتا۔ (جہاں ہند لیتھو پریس و ہفتہ وار ''مورچہ'' کا آفس تھا) اس وقت تاج انور پریس اور ہفتہ وار ''مورچہ'' کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ کلام حیدری زیادہ وقت ''جنتا ہیوم پائپ فیکٹری'' (بیراگی) میں رہا کرتے تھے۔ ہاں گاہے گاہے بیراگی سے واپسی پر ایک دو گھنٹہ کے لیے ''مورچہ'' آفس ضرور جاتے تھے۔ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر وہ مارکیٹ اور گورنمنٹ دفاتر میں اپنے بزنس کے سلسلے میں چلے جاتے، اسی لیے میں ''رینہ ہاؤس'' نہیں جا پاتا تھا، کیوں کہ کئی مرتبہ دروازے سے واپس آنا پڑا تھا۔ پروفیسر تاج انور صاحب کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ ہند لیتھو پریس و ہفتہ وار ''مورچہ'' (گیا) کے آفس میں وہ صبح نو بجے سے شام سات بجے تک وقت دیا کرتے تھے۔ اسی اثنا میں گیا و بیرون شہر کے ادبا و شعرا تاج انور سے ملنے اور اپنی تخلیق سے متعلق جانکاری حاصل کرنے کے لیے پہنچ جاتے کہ:

''میری تخلیق شائع ہو گی یا نہیں......؟''

اسی سلسلے میں کئی مرتبہ میں خود بھی تاج انور سے ''مورچہ'' آفس میں مل چکا ہوں۔ اسی جگہ حسین الحق سے بھی (جنہیں مرحوم کہتے ہوئے کلیجہ منھ کو آتا ہے) سرسری ملاقات ہوئی۔ نواب حسن نواب مرحوم کو بھی پہچانا۔ اس کے علاوہ کئی دوسرے لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں۔ اتفاق سے ایک دن کلام حیدری صاحب ''مورچہ'' آفس میں بیٹھے ہوئے مل گئے۔ میں نے جب انہیں سلام کیا تو اٹھ کھڑے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے شکایتی لہجہ میں کہا:

''آپ 'مورچہ' آفس میں تاج انور سے ملاقات کرتے ہیں، لیکن مجھ سے نہیں، ایسا کیوں؟'' میں نے معذرت کے ساتھ کہا:

''حضور......آپ 'جنتا ہیوم پائپ' بیراگی کے آفس میں تقریباً دس بجے دن میں نکل جاتے ہیں، پھر 'رینہ ہاؤس' سرکٹ ہاؤس کیوں کر آؤں......؟''

کلام حیدری صاحب نے مختصر جواب میں کہا:

''ہاں! بات سچ ہے۔''

چند سال بعد ''مورچہ آفس'' منتقل ہوکر ''رینہ ہاؤس سرکٹ ہاؤس'' آ گیا۔ اس وقت تک تاج انور صاحب بھی پروفیسر بن کر مرزا غالب کالج میں جا چکے تھے، لہٰذا ''مورچہ'' وہند لیتھو پریس ''رینہ ہاؤس'' آفس میں تاج انور کی جگہ پر ایک خوبصورت نوجوان عشرت ظہیر آ گئے۔

عشرت ظہیر تیز وطرار اور ذہین نوجوان تھے۔ انہوں نے کئی سال تک بہت خوش اسلوبی سے ہند لیتھو پریس اور ''مورچہ'' و ''آہنگ'' کی دیکھ بھال کی۔ کلام حیدری کی صحبت میں رہ کر عشرت ظہیر افسانہ نگار بنے، کیوں کہ اس کے قبل مجھے ان کا کوئی بھی افسانہ کسی رسالے یا اخبار میں دیکھنے یا پڑھنے کو نہیں ملا۔ آج عشرت ظہیر فکشن نگاروں کے نام میں ایک معتبر نام ہے، اب میں جب بھی کسی کام کے تحت گیا جاتا تو یقیناً ''مورچہ'' آفس (رینہ ہاؤس) جا کر کلام حیدری اور عشرت ظہیر سے ملاقات کرتا کیوں کہ یہ دونوں بہت ہی مخلص انسان تھے، جنہیں بھولنا چاہوں بھی تو نہیں بھول سکتا۔

ہاں یہ سچ ہے کہ اسد ظہیر کے ذریعے ہی عشرت ظہیر سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ دونوں بھائی بہت ہی مخلص رہے ہیں۔ اس زمانہ میں معین شاہد واسد ظہیر ہفتہ وار ''آدرش'' نکال رہے تھے جو اخباری سائز میں تھا۔ اس اخبار میں ''مورچہ'' جیسی ہی معیاری ادبی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ معین شاہد وعشرت ظہیر کے اصرار پر ہی میں ہفتہ وار ''آدرش'' میں برائے اشاعت اپنی تخلیق دیتا رہا۔ میں اس زمانہ میں افسانوں کے ساتھ ادبی انٹرویوز لینے کا بھی سلسلہ شروع کر چکا تھا۔

سب سے پہلے میں نے ۲۰ر جولائی ۱۹۶۲ء میں فلم وادب کے شاعر راجہ مہدی علی خاں (مرحوم) سے انٹرویو ان ہی کی تحریر میں حاصل کیا، جو ہندو پاک کے معیاری رسالوں میں شائع ہوا۔ ''ادب لطیف'' (پاکستان) ''ادا کار'' (دہلی) نے اس انٹرویو کے ساتھ ادارتی نوٹ بھی دیا تھا جس نے بحث کا دروازہ وا کیا۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی کے تحت کلام حیدری صاحب سے ان کی اپنی تحریر میں انٹرویو لینا چاہا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیتے ہوئے کہا:

''آپ پہلے ڈاکٹر وہاب اشرفی سے ادبی انٹرویو لے لیجئے۔'' میں نے جواب میں بتایا کہ:

''صد حیف! ان کے لیے سوالات ترتیب نہیں دے سکا ہوں، انشاءاللہ آئندہ آمد پر ان سے بھی تحریری انٹرویو لے لوں گا۔''

کلام حیدری نے مجھ سے دریافت کیا:

''آپ اب تک کن کن ادبا سے انٹرویو لے چکے ہیں؟''

''حضور! اب تک راجہ مہدی علی خاں، رام لال، جوگیندر پال، احتشام حسین، سید اعجاز حسین اور جوش ملیح آبادی سے ان کی اپنی تحریر میں انٹرویو لے چکا ہوں۔'' کلام حیدری نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ سب انٹرویوز برائے اشاعت 'مورچہ' کو دے دیں۔''

''انشا اللہ، آئندہ گیا آنے پر سارے انٹرویوز آپ کے حوالے کر دوں گا۔ آپ گاہے گاہے اُسے شائع کرتے رہیں۔''

''ضرور! دیکھئے آئندہ وہاب اشرفی کے لیے سوالات ترتیب دے کر جب لائیں تو مجھے ایک نگاہ ضرور دکھا لیں تا کہ جو کچھ خامیاں ہوں تو اسے نکال دوں۔''

''ہاں میں آپ کو دکھائے بغیر سوالات وہاب اشرفی کو نہیں دوں گا، یقین جانئے۔''

کلام صاحب یک بیک اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی اجازت لے کر عشرت ظہیر کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر تک عشرت ظہیر سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر کار میں بھی ''رینہ ہاؤس'' سے نکل کر گیوال بیگہ کی جانب چل پڑا۔ دوسرے دن میں پھر ''رینہ ہاؤس'' پہنچا تو وہاں بہت سارے لوگوں کو یکجا دیکھا۔ میں نے جیسے ہی ''رینہ ہاؤس'' سے باہر نکلنا چاہا تو عشرت ظہیر نے آواز دے کر مجھے روک لیا، پھر انہوں نے تمام بیٹھے ہوئے حضرات کا یکے بعد دیگرے تعارف کرایا:

''یہ حضرت ڈاکٹر مثنیٰ رضوی صاحب، پروفیسر شاہد احمد شعیب، قسیم گیاوی اور شاہد کلیم ہیں۔ میں جہاں تک سمجھتا ہوں کہ آپ ان حضرات کے نام وتخلیقات سے یقیناً آشنا ہوں گے، کیوں کہ ان کی تخلیقات ہفتہ وار ''مورچہ'' کے علاوہ ہندو پاک کے کئی مشہور رسائل میں

شائع ہوتی رہتی ہیں۔‘‘

میں ان سبھوں کے نام سے واقف تھا۔شاہد احمد شعیب مجھے اپنے پاس بیٹھا کر بہت ساری باتیں کرتے رہے۔گاہے گاہے وسیؔم گیاوی بھی اورنگ آباد (بہار) کے شعرا وادبا سے متعلق پوچھتے رہے۔ اسی وقت میں نے دیکھا کہ کلام حیدری صاحب بغل میں فائل دبائے خراماں خراماں اپنے ٹیبل کے نزدیک پہنچے اور سلام و دعا کرتے ہوئے اپنی کرسی پر بیٹھ گئے، پھر میری جانب دیکھتے ہوئے کہا:

’’اچھا ہوا آپ اسی جگہ موجود ہیں، میں ان سب حضرات سے آپ کا تعارف کراتا ہوں۔‘‘ شاہد احمد شعیب نے فوری جواب دیا:

’’ارے بھائی عشرت ظہیر نے ہم سب کا تعارف کرا دیا ہے،اس کی کوئی ضروورت نہیں ہے۔‘‘

یہ کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگے،ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی چیز کی جستجو کر رہے ہیں۔وسیؔم گیاوی نے شاہد احمد شعیب کو کہا:

’’کیا خلا میں ڈھونڈ رہے ہیں؟‘‘

شاہد احمد شعیب نے خشمگیں نظر سے دیکھا۔ڈاکٹر مثنیٰ رضوی خاموش طبع انسان تھے اور وسیؔم گیاوی کی بات سن کر شاہد کلیم مسکرانے لگے۔تھوڑی دیر تک مختلف نوعیت کی باتیں ہوتی رہیں۔گفتگو میں وائس چانسلر مرزا غالبؔ کالج ،گیا، گیا کالج ،مہیلا کالج اور انوگرہ کالج کے پروفیسروں کی ایکٹی ویٹی پر سبھی اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد کلام حیدری اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور اپنی گاڑی سے ’’ہیوم پائپ فیکٹری‘‘ بیراگی کی جانب چل پڑے۔شاہد احمد شعیب نے ،ڈاکٹر مثنیٰ رضوی کو لے کر ڈاکٹر وہاب اشرفی سے ملاقات کے لئے ان کی رہائش گاہ کی جانب قدم بڑھایا،اسی وقت ایک رکشا وسیؔم گیاوی و شاہد کلیم کے نزدیک جا ٹھہرا۔ میں نے دیکھا وہ دونوں رکشا پر سوار ہو کر مارکیٹ کی جانب چل پڑے۔ میں بھی خراماں خراماں قدم بڑھاتے ہوئے اپنی منزل مقصود کی جانب روانہ ہوا۔

دن کے تقریباً ساڑھے بارہ بج چکے تھے،لہٰذا میں نے اپنی قیام گاہ پر پہنچ کر فوراً دوپہر کا کھانا کھایا اور پھر ایک رکشا کے ذریعہ راجیہ بس اسٹاپ پہنچا۔اورنگ آباد جانے والی،بس اسٹینڈ پر لگی ہوئی تھی۔اس بس کا ڈرائیور ہمارے کلامی محلّہ کا رہنے والا نوجوان اور ہم عصر ساتھی نظام الدین تھا، اس نے مجھے بس ٹکٹ لینے سے منع کیا اور مجھے اپنے آگے کی سیٹ پر بیٹھا لیا۔بس چل پڑی ہم دونوں گاہے گاہے باتیں کرتے ہوئے اورنگ آباد بس اسٹاپ پہنچے ،تھوڑی دیر بعد نظام ہمیں رکشا پر بیٹھا کر راجیہ بس کے آفس میں چلا گیا۔

اس زمانے میں میرا ’’چائے پتی‘‘ کا بزنس تھا،لہٰذا ہر ماہ کئی چائے کی بیٹیاں آسام، دارجلنگ اور کلکتہ سے گیا بذریعہ دہلی ٹرانسپورٹ آتی تھیں،س لئے مجھے ہر ماہ گیا جانا ضروری ہوتا تھا۔چند دنوں بعد دہلی ٹرانسپورٹ، گیا کے منیجر نے مجھے فون سے اطلاع دی کہ:

’’چائے کی پیٹیاں آئی ہوئی ہیں،آپ جلد اٹھا لیں۔‘‘

میں ہفتہ دنوں کے بعد گیا روانہ ہو گیا۔چائے کی پیٹیاں دہلی ٹرانسپورٹ سے اٹھا کر اورنگ آباد بھیجوا دیا اور میں نے تین دنوں تک گیا میں رہ کر کلام حیدری سے ادبی انٹرویو کے لئے سوال نامے کے جوابات حاصل کر لئے اور ڈاکٹر وہاب اشرفی سے جو میں نے انٹرویو کے لئے سوالنامہ ترتیب دیا تھا وہ کلام حیدری کو ایک نظر دیکھنے کے لئے دے دیا۔انہوں نے اسی وقت میرے دیے ہوئے سوالنامے پر ایک نظر دیکھ کر واپس کرتے ہوئے وہاب اشرفی کو فون کیا:

’’آپ کے پاس نثار احمد صدیقی جا رہے ہیں، انہیں آپ سے ایک کام ہے،اسے مکمل کر کے دو دنوں کے اندر دے دیں۔‘‘

اور پھر مجھے کلام حیدری نے ’’وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ‘‘ اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیا۔اس زمانہ میں ڈاکٹر وہاب اشرفی گیا میں ہی پروفیسر کے عہدہ پر فائز تھے ،لہٰذا میں ان کے دروازہ پر پہنچا ہی تھا کہ وہ باہر نکل پڑے اور مجھ سے شکایتی لہجے میں کہا:

’’جناب ایک زمانہ کے بعد آپ سے ملاقات ہو رہی ہے۔ آپ اتنے دنوں سے کہاں کھوئے ہوئے تھے؟‘‘ یہ کہتے ہوئے مجھے ہاتھ پکڑ کر اپنے روم میں لے گئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر اسی اثنا میں چائے بسکٹ آ گئے، ہم دونوں باتوں کے درمیان چائے بسکٹ سے شغل کرنے لگے۔تھوڑی دیر بعد میں نے انٹرویو کا سوالنامہ ان کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وہ سوالنامہ لے کر اور سرسری نظر دیکھ کر

بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے:

''کل شام تک انشاءاللہ اسے مکمل کردوں گا، آٹھ بجے رات میں آپ آکر لے جائیں۔'' میں ہنکاری بھرتے ہوئے ان کے روم سے نکل کر اپنی قیام گاہ (گیوال بیگہ) کی جانب روانہ ہوگیا۔ میں دوسرے دن وقت مقررہ پر ڈاکٹر وہاب اشرفی کی قیام گاہ تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی کلام حیدری صاحب کے یہاں یعنی ''رینہ ہاؤس'' گئے ہیں۔ میں بھی وہاں سے چہل قدمی کرتے ہوئے ''رینہ ہاؤس'' پہنچا، وہاں میں نے دیکھا، کلام حیدری صاحب اپنے ایزی چیئر پر بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی انہوں نے کہا:

''آپ تشریف لائیے......''

میں جب ان کے چیمبر میں پہنچا تو ڈاکٹر وہاب اشرفی کے ساتھ ایک نئے شخص نظر آئے۔ میں وہاب اشرفی کے پاس ہی بیٹھا کہ انہوں نے کہا:

''میں آپ کا انتظار ہی کررہا تھا۔''

اسی وقت جناب نرمدیشور (وائس چانسلر مگدھ یونیورسیٹی گیا) آگئے۔ ان ہی کے اصرار پر میں کلام صاحب کے یہاں چلا آیا، پھر کہنے لگے:

''بہتر ہوا آپ یہاں چلے آئے۔ ان سے ملئے یہ اردو ہندی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ جلد ہی کلام حیدری صاحب اپنے پریس سے ان کے شعری مجموعے اردو زبان میں شائع کررہے ہیں۔ آپ ان کی شعری تخلیقات پڑھ کر یقیناً لطف اندوز ہوں گے اور ان کے معیار سے واقف ہوں گے۔''

اسی وقت کلام حیدری صاحب نے کہا:

''کیا وہاب صاحب آپ نے ان کے سوالنامہ کا جواب مکمل کیا یا......؟''

''ہاں بھائی مکمل کرچکا ہوں۔''

وہاب صاحب نے مختصر جواب دیا، اسی وقت میں نے کہا:

''کل دس بجے دن میں آپ سے مکمل شدہ انٹرویو لے لوں گا۔''

''ٹھیک ہے......''

پھر تھوڑی دیر بعد چائے آگئی۔ اس سے ہم سب لطف اندوز ہونے لگے اسی درمیان کلام حیدری وائس چانسلر نرمدیشور جی سے اردو زبان کی زبوں حالی پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔ میں نے بھی اس گفتگو میں شریک ہوکر کچھ نکتے کی بات بتائی جس سے موجود تمام حضرات نے اتفاق کیا۔

تھوڑی دیر بعد کلام حیدری صاحب نے ایزی چیئر چھوڑ دیا اور پھر ہم چاروں کلام حیدری صاحب کی گاڑی سے ہی (وائس چانسلر صاحب نے اپنی گاڑی رینہ ہاؤس میں ہی چھوڑ دیا تھا) مارکیٹ چلے آئے۔ ''پالت مارکیٹ'' کے اندر جا کر ایک بنگلہ نما مکان کے سامنے کھڑے ہوگئے۔ اسی وقت ایک شخص باہر آئے اور ہم چاروں کو بڑی عزت کے ساتھ اندر لے گئے۔ صاحب مکان سے تعارف کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ یہ مارکیٹ جے کمار پالت جی کا ہی ہے اور یہ شخص کانگریس کے حامی اور ترقی پسند خیال رکھتے ہیں۔ جے کمار پالت سے میری کوئی خاص گفتگو نہیں ہوئی کیوں کہ یہ سب سیاسی گفتگو کررہے تھے۔ دو گھنٹہ بعد وہاں سے ہم لوگ ''رینہ ہاؤس'' پہنچے اور پھر ہم سب اپنی اپنی راہ ہولیے۔

دوسرے دن تقریباً گیارہ بجے ڈاکٹر وہاب اشرفی کی قیام گاہ پہنچا تو اتفاق ہے وہاں کوئی بھی اشرفی صاحب سے ملنے والا نظر نہیں آیا۔ میں وہاب اشرفی صاحب سے مکمل شدہ انٹرویو لے کر چند منٹوں میں واپس آگیا کیوں کہ وہاب اشرفی صاحب کو گیا کالج بارہ بجے کے قبل پہنچنا ضروری تھا، لہٰذا وقت کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہوئے اور میں اسی دن چھ بجے شام راجیہ بس سے اورنگ آباد واپس آگیا۔

چند دنوں بعد معلوم ہوا کہ کلام حیدری صاحب نے ''جنتا ہیوم پائپ فیکٹری'' کی ایک شاخ اورنگ آباد شہر سے پانچ کیلومیٹر دور بھرتھولی گاؤں (لب سڑک گاؤں) میں قائم کیا ہے۔ قائم کرنے سے قبل کئی مرتبہ اورنگ آباد بھرتھولی آئے، لیکن اتفاق سے کبھی ملاقات نہیں ہو پائی۔ میں بھی ان دنوں ذہنی طور پر پریشان تھا۔ دراصل میرے والد صاحب کول فیکٹری (این۔سی۔ڈی۔سی گدی اے) سے سبکدوش ہوکر گھر چلے آئے تھے۔

اس زمانے میں کول فیلڈ سے سبکدوش ورکروں کو کوئی پنشن نہیں تھی، جس کی وجہ سے ہم سب گھر والے پریشان تھے۔ تین چھوٹے

بھائی، دو چھوٹی بہنوں کے ساتھ گھر کی پوری ذمہ داری۔ حالات دن بہ دن خراب ہوتے گئے۔ تین چار سالوں تک ہم سب پریشان رہے۔ اس دوران میں نے کبھی بھی کلام حیدری صاحب سے ملاقات نہیں کی، لیکن میں ان کی خیریت برابر لیتا رہا۔

ایک دن اتفاق سے اپنے باہر والے روم (جو ہم سب بھائیوں کا مطالعہ گاہ تھا) کا دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا کہ ایک ایمبسڈر گاڑی کھڑی ہے۔ کچھ دیر کے بعد کلامی محلّہ مسجد کے مؤذن کے ساتھ کلام حیدری صاحب نظر آئے تو میں نے فوراً اپنے کمرے سے نکل کر کلام حیدری صاحب کا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے شکایتی انداز میں کہا:

''مؤذن صاحب کی وجہ سے آپ مل گئے، ورنہ......''

ان کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے میں انہیں اپنے روم میں لے آیا۔ میں نے جیسے ہی اپنے چھوٹے بھائی اسلم (جو مرحوم ہو چکے ہیں) کو آواز دی، انہوں نے مجھے منع کرتے ہوئے کہا:

''کوئی خاطر کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف ایک کپ چائے نوش کروں گا۔''

پھر آگے مزید کہا:

''میں آپ کو اپنے ساتھ گیا لے جانے کو آیا ہوں۔ دراصل عشرت ظہیر صاحب کی گورنمنٹ سروس ہوگئی ہے۔ وہ 'مورچہ' و' آہنگ' آفس چھوڑ کر چلے گئے۔ 'مورچہ'۔' آہنگ' اور پریس دیکھنے والا کوئی نہیں ہے، لہٰذا آپ میرے ساتھ چلیں اور آفس سنبھال لیں۔''

میں انہیں تعجب خیز نظروں سے دیکھنے لگا اور سوچنے لگا کہ اس گیا شہر میں مجھ سے بہتر ادب کی سوجھ بوجھ رکھنے والے موجود ہیں پھر مجھے کیوں؟ بہر حال ان سے وعدہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ ایک ہفتہ کے اندر گیا پہنچ جاؤں گا، لیکن وہ بہ ضد تھے کہ ساتھ ہی چلیں۔ کسی طرح انہیں اعتماد میں لے کر گیا واپس بھیج دیا۔ میں نے گھر میں اپنے والدین سے مشورہ کیا اور تیسرے دن گیا کے لئے روانہ ہو گیا۔

گیا پہنچنے کے بعد دو دنوں تک کلام حیدری صاحب سے ملاقات نہیں کی اور باہر باہر سے پریس آفس کا جائزہ لیا۔ ہندلیتھو پریس میکلوڈ گنج (معروف گنج) میں تھا۔ شام کے وقت ہندلیتھو پریس چلا گیا۔ وہاں کے کارکنوں سے ملاقات کرتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں کلام حیدری صاحب کے ساتھ کام کروں گا اور پھر ہندلیتھو پریس سے واپسی پر معروف گنج لب روڈ ایک خوبصورت ہوٹل میں چائے پینے کے لیے داخل ہو گیا۔

وہاں اتفاق سے آل رسول صاحب جو رفیع گنج کے رہنے والے تھے (ان سے پہلے اورنگ آباد میں محمد کلام کی دکان پوپلر اوٹو ٹریڈرس، مدرسہ روڈ میں ملاقات ہو چکی تھی) انہیں اس ہوٹل میں بیٹھے دیکھا تو میں الٹے پاؤں واپس جانا چاہا، اسی وقت آل رسول نے مجھے پکڑا اور اپنے پاس بیٹھا کر چائے، سموسے اور کباب سے خاطر کرنے لگے۔ گفتگو کے دوران مجھے معلوم ہوا کہ جناب عالی کلام حیدری صاحب کے یہاں کارخانے سے متعلق مقدمات کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ میں نے بھی اپنی بات کہہ دی کہ مجھے ''مورچہ''، ''آہنگ'' اور پریس کو دیکھنے کے لئے کلام حیدری صاحب نے آفر دیا ہے۔ آل رسول صاحب بہت خوش ہوئے اور ساتھ لیے ہوئے ''رینہ ہاؤس'' پہنچ گئے۔ کلام حیدری صاحب نے مجھے دیکھتے ہی کہا:

''اللہ کا کرم ہے کہ آپ آ گئے۔'' آل رسول صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:

''جی نہیں سر! انہیں میں پکڑ کر معروف گنج سے لایا ہوں۔''

چند باتیں ہونے کے بعد دوسرے دن مجھے آفس جوائن کرنے کے لئے کلام حیدری صاحب نے کہا اور پھر میں دوسرے دن ''رینہ ہاؤس'' جا کر عشرت ظہیر کی کرسی پر براجمان ہو گیا۔ آل رسول صاحب نے میری کافی مدد کی اور یہاں کے اندرونی و بیرونی حالات سے واقف کراتے ہوئے مجھے اس لائق بنایا کہ میں انفرادی طور پر پریس ''مورچہ''، ''آہنگ'' اور کلچرل اکادمی سنبھال سکوں اور میں نے سنبھال لیا۔

جب میرے بارے میں ہند و پاک کے ذہین فن کاروں کو معلوم ہوا کہ ''آہنگ'' و ''مورچہ'' سے نثار احمد صدیقی منسلک ہو گئے ہیں تو سیکڑوں کی تعداد میں مبارک باد کے خطوط کلام حیدری کے نام آئے جن میں سے چند خطوط ہفتہ وار ''مورچہ'' میں شائع بھی ہوئے۔ چند ماہ بعد وہ ''رینہ ہاؤس'' سے ادبی ہاؤس بن گیا۔ میں حسب صلاحیت ہفتہ

وار''مورچہ'' اور ماہنامہ''آہنگ'' کوخوب سے خوب تر اور معیاری بنانے کی بھرپورکوشش کرتا رہااوراس میں کامیابی بھی ملی۔

کلام حیدری صاحب کے ساتھ کام کرنے میں بڑامزہ آرہا تھا۔انہوں نے مجھے ادبی صحافت کی باریکی سکھائی اور''اداریہ'' لکھنے کا طریقہ بتایا۔ ہفتہ وار''مورچہ'' نیم سیاسی اخبار تھا، اس لیے اس کے اندرونی صفحات میں اہم خبروں کے علاوہ سیاسی باتوں پرتنقید بھی ہوتی تھی ۔اس کا اداریہ خالص سیاسی موضوع پر ہوتا تھا۔ مجھے کلام حیدری صاحب نے اداریہ لکھنے گر بتاتے ہوئے کہا:''کبھی بھی اداریہ کے جملوں میں 'میں'اور'ہم' کا استعمال نہ کریں۔''

میں نے اس بات کوگرہ میں باندھ لیااور جب بھی''مورچہ'' کے لیے اداریہ لکھتا، کلام حیدری صاحب کا جملہ سامنے رکھ کر لکھتا۔ ویسے اداریہ گاہے گاہے ہی لکھتا تھا، زیادہ تر کلام حیدری صاحب ہی ''آہنگ'' و''مورچہ'' کا اداریہ لکھتے تھے۔ویسے میں نے جب بھی ''مورچہ'' کے لئے اداریہ تحریر کیا، وہ کلام صاحب کے نظر ثانی کے بعد ہی شائع ہوئے۔''مورچہ'' کا''آزادی نمبر''اور''شہید کربلا نمبر'' قابل ذکر اور قابل تحسین رہا۔ان دوخصوصی شمارے کے لیے مختلف معروف و منفرد فنکاروں سے تخلیقات حاصل کی جاتی تھیں۔

''رینہ ہاؤس'' جوادبی ہاؤس میں تبدیل ہو چکا تھا، یہاں ہندوستان کے بہت سارے ادبا وشعرا ادبی مہمان بن کر چند دنوں کے لیے آتے اور پھر چلے جاتے۔ان حضرات کی مہمان نوازی کلام حیدری صاحب بہت خلوص ومحبت سے کرتے۔ان لوگوں کوکبھی شکایت کا موقع نہیں دیتے۔ یہاں حسن نعیم صاحب اپنی خاص خوبصورت وحسین گلوکارہ کے ساتھ ہفتہ دس دنوں تک رہے۔اپنی غزلوں کوخوبصورت گلوکارہ کی آواز میں چندمخصوص حضرات کلام حیدری، مثنیٰ رضوی، شاہد احمد شعیب، قسیم گیاوی، شاہد کلیم، حق اعظمی، م۔ق۔خاں، فرحت قادری، نوشابہ حق، شاہدہ حیدری، بدر اورنگ آبادی، راقم الحروف اور کئی دوسروں کے سامنے پیش کیا تھا جو کافی لطف دے گیا تھا۔حسن نعیم کی خوبصورت غزلوں کوجس انداز سے گلوکارہ نے پیش کیا وہ لائق تحسین تھا۔

ایک دن اسی طرح وحید اختر (جدت پسند شاعر وعلی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کے پروفیسر)''رینہ ہاؤس'' میں تشریف لائے تو ان کی خاطر مدارات میں کوئی کمی کلام حیدری صاحب نے نہیں ہونے دی۔وحید اختر انگور کی بیٹی سے زیادہ عشق کرتے تھے، اسی لیے کلام حیدری صاحب نے ان کے لئے خصوصی طور پر دوکارٹون منگوا کر مہمان خانہ میں رکھ چھوڑا تھا۔اسی شام کلام حیدری صاحب نے مجھ سے کہا:

''کل صبح پٹنہ چلے جائیں، وہاں کلیم الدین احمد صاحب نے آپ کو یاد کیا ہے۔''

دوسرے دن پٹنہ چلا گیا۔تقریباً گیارہ بجے دن میں کرشنا پوری کلیم الدین احمد صاحب کے یہاں پہنچا تو انہوں نے اپنے روم میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے سلام کیا تو انہوں نے ایک کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔تھوڑی دیر وہ کچھ لکھتے رہے، پھر میری جانب مخاطب ہوکر کہا:

''آپ نے بہار اردو اکادمی میں اشاعتی مالی تعاون کے لیے 'عکس' نام سے ایک مسودہ جمع کیا ہے۔یہ خالص ادبی انٹرویوز ہیں۔آپ نے ان ادبا سے کیسے اور کس طرح ادبی انٹرویو لیا؟ مجھے تفصیل بتائیں۔''

میں نے انہیں پوری تفصیل بتائی۔انہوں نے پھر سوال کیا:''آپ کلام حیدری صاحب کے ساتھ کام کررہے ہیں، کیا وہ اپنے پریس سے شائع نہیں کر سکتے۔''

میں خاموش رہا، پھر انہوں نے چائے بسکٹ سے خاطر کرتے ہوئے مجھے رخصت کیا۔

واپسی پر ساری باتیں کلام حیدری صاحب کے گوش گزار کر دیا اور وہ مسکرا کر رہ گئے۔ چند دنوں بعد بہار اردو اکادمی نے اشاعتی مالی تعاون کی فہرست جاری کی جس میں''عکس''(انٹرویو کا مجموعہ) کو بھی اشاعتی مالی تعاون کے لیے منتخب کیا گیا۔

مالی تعاون ملنے کے دوسرے ماہ میں ہی''عکس'' شائع ہوکر منظر عام پر آ گیا اور یہ کافی تعداد میں فروخت ہوا، کیوں کہ اس کتاب کو لکھنؤ یونیورسیٹی نے ایم۔اے نصاب میں شامل کرلیا تھا اور پھر اس کے دوسرے سال کراچی یونیورسیٹی (پاکستان) میں بھی ایم۔اے نصاب میں کئی سالوں تک یہ کتاب شامل رہی۔اس بات کا انکشاف کراچی یونیورسیٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے، جنہیں فکشن کا

جیدنقاد کہا جاتا ہے، مجھے اپنا انٹرویو دیتے وقت کیا تھا، پھر انہوں نے ڈاکٹر اسلام عشرت کا مختصر مضمون ''عکس: ایک جائزہ'' بھی اپنے ترقی پسند تحریک کے مشہور ومعروف رسالہ ''قومی زبان'' میں شائع کرکے ادارتی نوٹ کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ تقریباً چھ ماہ بعد پھر پٹنہ جانا ہوا تو کلام حیدری صاحب نے ایک دستی خط دیتے ہوئے کہا:

''آپ اس دستی خط کو جی۔ سی۔ کندرا صاحب (اس زمانہ میں چیف سکریٹری آف بہار تھے) تک پہنچادیں۔''

میں نے وہ دستی خط لے کر جی۔ سی۔ کندرا صاحب تک پہنچا دیا۔ ساتھ ہی چند کتابیں بھی تھیں، ان کتابوں کے ساتھ میرا انٹرویو کا مجموعہ ''عکس'' بھی شامل تھا۔ ''عکس'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے چند سوالات کندرا صاحب نے کیے، جس کا معقول جواب سن کر خوش ہوئے اور اپنے یہاں قیام کرنے کے لیے مجبور کردیا، حالاں کہ میں انکار کرتا رہا، لیکن ان کی اہلیہ کے اصرار پر مجھے ان کے یہاں قیام کرنا پڑا۔ سات بجے شان گارڈن میں بیٹھ کر جوگندر پال، رام لال، شرون کمار، بلراج کومل، پروفیسر احتشام حسین، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور جوش ملیح آبادی سے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ انہوں نے بتایا کہ:

''مجھے جوگندر پال، رام لال، گوپی چند نارنگ اور جوش ملیح آبادی سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ یہ سب بڑے خلیق لوگ ہیں۔''

اس کے بعد بھابھی جان (اہلیہ کندرا صاحب) نے ایک ٹیبل پر کھانا لگا دیا، ہم تینوں ایک ہی ساتھ کھانا کھا کر اپنے اپنے روم میں شب باشی کے لئے چلے گئے۔ دوسرے دن چائے ناشتہ کے بعد اپنی گاڑی سے ریلوے اسٹیشن بھیج دیا۔

پٹنہ سے واپسی پر ڈاکٹر وحید اختر کو میں نے دیکھا کہ ''انگور کی بیٹی'' لئے ہوئے ہیں اور اسی حالت میں جھومتے جھامتے میرے ٹیبل کے نزدیک آکر بیٹھ گئے اور مختلف موضوعات پر بحث ومباحثہ کرتے رہے۔ میں خاموشی سے مختصر سا جواب دیتا اور پھر میں اپنے آفس کے کاموں میں مشغول ہوجاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وحید اختر کا مطالعہ کافی وسیع تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ''جدیدیت'' پر وہ ریسرچ کیے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں نئی تشبیہات واستعارات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ مضامین بھی وہ خوب لکھتے تھے۔ ایک دن میں جب آفس آیا اور اپنے چیمبر میں بیٹھ کر آفس کا کام کرنا چاہا تو اسی وقت وحید اختر نازل ہوئے اور جھومتے ہوئے کہا:

''یار تم بھی کبھی کبھی انگور کی بیٹی سے کھیلا کرو۔''

میں نے جواب دیتے ہوئے کہا:

''معاف کیجئے...... یہ آپ ہی کو مبارک ہو۔''

''ارے صدیقی صاحب...... آپ سنی مسلمان ہیں پھر بھی اس سے نفرت، دیکھئے میں اہل تشعہ ہوں اور انگور کی بیٹی سے دن رات کھیلتا رہتا ہوں۔''

اس جملے کا میں نے کچھ بھی جواب نہیں دیا اور اپنے آفس کے کام میں مشغول ہوگیا۔ وحید اختر ہمارے پاس سے اٹھ کر مہمان خانہ میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے لئے مجھے راحت ملی اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ تقریباً دو گھنٹہ بعد وحید اختر پھر میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا:

''صدیقی صاحب آپ نے مخمور سعیدی، بلراج کومل اور ساجدہ زیدی سے انٹرویو بہت خوبصورت اور نئے انداز میں لیا، لیکن مجھے کیوں چھوڑ دیا...... وجہ......؟''

''بھائی وحید صاحب آپ میری فہرست میں ہیں، آپ کے لائق سوالات ابھی ترتیب نہیں دے پایا ہوں، جب سوالات ترتیب دے لوں گا تو آپ کی شکایت دور ہوجائے گی۔''

میں یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ اسی وقت پروفیسر شاہد احمد شعیب میرے چیمبر میں داخل ہوئے اور وحید اختر کو مخاطب کرکے کہا:

''کیوں جناب مگدھ یونیورسیٹی چلنا ہے یا نہیں؟''

وحید اختر نے جواب دیا:

''میں بالکل تیار ہوں، چلئے یہ کہہ کر دونوں ہمارے چیمبر سے نکل گئے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور پھر میں ماہنامہ ''آہنگ'' کے تازہ شمارہ کے لئے میٹر (مواد) یکجا کرنے لگا، کیوں کہ آج ہی کاتب کو کتابت کے لئے دینا تھا۔

کلام حیدری صاحب ''جنتا ہیوم پائپ فیکٹری'' سے واپس

آ کر اپنے چیمبر میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ایک چپراسی کے ذریعہ مجھے اپنے چیمبر میں بلوایا۔ میں نے ''آہنگ'' کے لئے جو بھی میٹر یکجا کیا تھا، وہ سب لے جا کر کلام حیدری صاحب کے ٹیبل پر رکھ دیا۔ انہوں نے ایک نظر دیکھا اور پھر وہ سب میٹر کاتب امیر حسن رضوی کو سپرد کر دیا۔ ہفتہ وار ''مورچہ'' کی کتابت کلیم القاسمی ڈنگروی کرتے تھے، لہٰذا ان کے لئے بھی میٹر تیار تھا، کلام صاحب نے ایک نظر دیکھ کر اس میٹر کو کلیم القاسمی ڈنگروی کو دے دیا۔ ماہنامہ ''آہنگ'' کے اداریہ سے متعلق کلام حیدری نے کہا:

''آپ کل مجھ سے اداریہ لے لیں گے۔''

میں نے کہا: ''......اور مورچہ کے لئے؟''

''وہ آپ لکھ لیں اور مجھے دکھا دیں گے۔'' اس کے بعد کلام صاحب اپنے چیمبر سے نکل گئے۔

اسی شام کلچرل اکادمی کی جانب سے ڈاکٹر وحید اختر کے اعزاز میں شعری و نثری نشست ہوئی جس میں کلام حیدری (چیئر مین کلچرل اکادمی، گیا) شاہد کلیم، حق اعظمی، فرحت قادری، قسیم گیاوی، م۔ق۔خان، معین شاہد، ڈاکٹر افصح ظفر، ادیب حسن ادیب، شاہد احمد شعیب، اسد ظہیر، حسین الحق، خورشید حیات، عشرت ظہیر، رام اقبال پرووائس چانسلر، فہیم انصاری صاحب وائس چانسلر اور راقم الحروف کے علاوہ اور کئی دوسرے شریک نشست ہوئے۔ یہ نشست بہت ہی کامیاب رہی تھی۔ اس نشست کے خصوصی مہمان وحید اختر کے اصرار پر شاہد احمد شعیب اور حق اعظمی نے کئی غزلوں اور نظموں سے سامعین کو محظوظ کیا۔ سامعین کے اصرار پر وحید اختر نے بھی کئی غزلیں اور نظمیں پیش کیں جو کافی پسند کی گئیں۔ اس نشست میں جو بھی شعری و نثری تخلیقات پیش کی گئی تھیں وہ سب ہفتہ وار ''مورچہ'' میں شائع ہوئیں۔ اس کے دوسرے دن وحید اختر علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئے۔

اس جگہ یعنی ''رینہ ہاؤس'' جگجیون روڈ گیا میں ہندوستان کے چھوٹے بڑے ادبا و شعرا کی آمد برابر ہوتی رہتی تھی۔ اسی جگہ میں نے نامور قلم کاروں کو آتے جاتے دیکھا۔ جوگندر پال، کرشنا پال (اہلیہ جوگندر پال) غیاث احمد گدی، ڈاکٹر حسن آرزو، صدیق مجیبی، شعیب شمس، سلطان اختر، قمر التوحید، مظہر امام، منظر شہاب، شہاب جعفری، علی احمد فاطمی، اسرار گاندھی، اسلام عشرت، ڈاکٹر محفوظ الحسن، فہیم انصاری، نزہت نوری اور کئی دوسرے لوگ آئے اور کلام حیدری صاحب کے خلوص و محبت سے متاثر ہو کر اپنی چھاپ چھوڑ کر چلے گئے۔

اسلام عشرت جب اورنگ آباد سے مجھ سے ملنے آئے تو ان کے ہاتھ میں کلام حیدری کے فن و شخصیت پر بھر پور اور مکمل مسودہ تھا جو بعد میں کلچرل اکادمی، گیا نے شائع بھی کیا۔ اسی طرح ''اورنگ آباد، بہار میں شعر و ادب'' ہم نے تعارفی مضمون تحریر کیا تھا، وہ بھی ڈاکٹر عبدالمغنی کے اصرار پر کلچرل اکادمی کے ذریعے ہی شائع ہوا۔

اسی جگہ میں نے پرانے اور نئی نسل کے فن کاروں کو دیکھا جن میں حسین الحق، عبدالصمد (دونوں ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ یافتہ) شوکت حیات، شفق، علی امام، شموئل احمد، مشرف عالم ذوقی، محمود واجد، اقبال واجد، عبدالمنان، احمد صغیر، سید احمد قادری، فردوس گیاوی، عین تابش، شگفتہ سہسرامی، افصح ظفر، ارتضیٰ کریم، نعیم صبا، جاوید حیات، بدنام نظر اور کئی دوسرے فن کار بھی نظر آئے۔

ارتضیٰ کریم سے میرے تعلقات کافی گہرے تھے، مگدھ یونیورسیٹی میں جب ان کا وائیوا ہونے والا تھا اس وقت کلام حیدری صاحب نے پروفیسر عنوان چشتی کو خبردار کر دیا کہ ارتضیٰ کریم پر خصوصی خیال رکھیں۔ عنوان چشتی وائیوا کے لئے جب مگدھ یونیورسیٹی آئے تو ''رینہ ہاؤس'' میں ہی کلام حیدری کے مہمان رہے۔ اس وقت پروفیسر عنوان چشتی مجھ سے کافی قریب ہوئے۔ بڑے دل کش اور خلوص والے پروفیسر تھے۔ انہوں نے دہلی آنے کے لیے مجھے دعوت بھی دی اور میں نے انہیں وعدہ بھی کیا۔ مگدھ یونیورسیٹی میں وائیوا کے بعد عنوان چشتی سیدھے ارتضیٰ کریم کے ساتھ ''رینہ ہاؤس'' آئے، اس زمانہ میں مگدھ یونیورسیٹی کے صدر شعبہ اردو پروفیسر طیب ابدالی تھے۔ عنوان چشتی صاحب مجھے لے کر پروفیسر طیب ابدالی کے یہاں گئے۔ اس وقت ہم دونوں کے ساتھ ارتضیٰ کریم بھی تھے۔ میں ماہنامہ ''آہنگ'' کا تازہ شمارہ دو جلد لیتا گیا۔

جب طیب ابدالی صاحب کے یہاں پہنچے تو انہوں نے

بہت ہی خلوص سے ہم تینوں کا خیر مقدم کیا۔ ایک ٹیبل کے نزدیک ہم چاروں کرسیوں پر بیٹھ گئے اور یونیورسیٹی کی باتیں ہونے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد ''آہنگ'' کا تازہ شمارہ انہیں پیش کیا تو وہ اسی جگہ ورق گردانی کرنے لگے۔ عمیق حنفی اور عادل منصوری کی شعری تخلیقات دیکھ کر طیب ابدالی صاحب نے کہا: ''اس طرح کی تخلیقات شائع کرنے سے کیا فائدہ......؟ جو سمجھ سے باہر ہو۔''

میں نے جواب دیا:

''آپ جیسے لوگوں کو جدید شاعری سمجھ میں نہیں آئے گی، جدیدیت کا جو رجحان ہے، اس کا بھرپور مطالعہ کرنا اور سمجھنا ضروری ہے۔''

طیب ابدالی صاحب خاموشی سے اندر چلے گئے چند کتابیں پروفیسر عنوان چشتی کو دیتے ہوئے کہا:

''جناب آپ بھی خانقاہی ہیں، میں بھی خانقاہی ہوں، ان کتابوں کا بغور مطالعہ کریں اور مجھے بتائیں کہ ان میں کیا خامیاں اور خوبیاں ہیں؟ جواب کا انتظار رہے گا۔''

اسی وقت ٹیبل پر چند طرح کے بسکٹ، بادام، کاجو اور کشمش آ گئے۔ ہم سب اس سے شغل کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد چائے بھی آ گئی۔ چائے نوش کرنے کے بعد پروفیسر عنوان چشتی اجازت لے کر واپس ''رینہ ہاؤس'' آئے اور یہاں دوپہر کا کھانا کھا کر ارتضٰی کریم کے ساتھ ریلوے اسٹیشن چلے گئے اور دہلی کے لئے روانہ ہو گئے۔

مجھے کلام حیدری کے یہاں آئے تقریباً چار سال ہو گئے تھے۔ میں کلام حیدری صاحب اور ان کے خاندان والوں سے بہت قریب ہو گیا۔ شاہدہ حیدری (بھابھی، کلام حیدری کی اہلیہ) اور ان کے بھائی ڈاکٹر خالد خیر، بہن نوشابہ حق اور کئی لوگ مجھے حد درجہ عزت و پیار دینے لگے۔

شاہدہ بھابھی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ وہ اور کلام حیدری صاحب مجھے اپنے گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ ان ہی دنوں کلام حیدری نے نوشابہ حق کو دو سال سے ماہنامہ ''آہنگ'' کی مدیرہ بنا دیا تھا، لیکن انہوں نے کبھی بھی ''آہنگ'' کی تخلیقات، سرورق وغیرہ پر کسی طرح کا کوئی ریمارکس نہیں دیا۔ نوشابہ حق خوبصورت اور حسین ترین عورت تھیں، میں انہیں سائرہ بانو کہتا تھا۔ شاہدہ بھابھی یہ سن کر ہنس دیتی تھیں۔ کلام حیدری صاحب اور شاہدہ بھابھی ہمارے بچوں سے حد درجہ پیار کرتے تھے۔ عید الفطر سے ہفتہ دنوں قبل شاہدہ بھابھی ہمارے یہاں آ کر سب ہی بچوں اور اہلیہ کو لے کر عید کی مارکیٹنگ کرتی تھیں اور بچوں کی پسند سے ہی ان کے کپڑے خریدے جاتے تھے، جو ایک مثال ہے۔

اسی زمانہ میں عبدالصمد کا بھی ''رینہ ہاؤس'' آنا جانا ہونے لگا تھا۔ انہیں بھی اسی زمانے سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ کلام حیدری ان کی تخلیقات کو ایک نظر دیکھ کر ''مورچہ'' اور ''آہنگ'' میں شائع کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرنے لگے۔ کچھ دنوں بعد انہیں مستقل طور پر مبصر بنا دیا تو ماہنامہ ''آہنگ'' کے ہر شمارے میں ان کے تبصرے آنے لگے۔ گاہے گاہے افسانے بھی شائع ہونے لگے۔

ماہنامہ ''آہنگ'' نے بہت سارے ذہین فکشن نگاروں کا خصوصی مطالعہ کے ذریعہ تعارف کرایا جن میں خصوصی طور پر شمیم افزا قمر، شمیم صادقہ، انور خان، شمس ندیم، عبدالصمد، شوکت حیات، م۔ق۔خان، شفق، حسین الحق، اختر واصف، انور شاہد، حمید سہروردی اور کئی دوسرے قابل ذکر ہیں جو آج اردو دنیا کے مشہور و معروف فکشن نگاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ ایک دن عبدالصمد نے کلام حیدری صاحب کو ایک فائل دیتے ہوئے کہا:

''ذرا اسے دیکھ لیں، جو بھی ترمیم و اضافہ کرنا ہو کر دیں۔''

وہ فائل کلام حیدری صاحب ٹیبل پر رکھ کر ''ہیوم پائپ فیکٹری'' بیرا گی چلے گئے۔ کلام حیدری کے جانے کے بعد اس فائل کو میں نے دیکھا اس فائل میں کافی طویل کہانی تھی۔ تقریباً فل اسکیپ کے ڈیڑھ سو صفحات تھے۔ کچھ حصے کو میں نے پڑھا۔ بہت ہی دلچسپ انداز میں یہ کہانی مکمل کی گئی تھی۔ چند سال بعد اسی طویل کہانی (ناول: ''دو گز زمین'') پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ملا جو قابل تعریف ہے۔

کلام حیدری صاحب کو اگر خلوص و محبت کا پیکر کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی مالی امداد کی ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس فہرست میں سیاسی لیڈر کے ساتھ وکلا، ادبا، شعرا بھی ہیں۔ میں گاہے گاہے Objection کرتا تو وہ ہنس کر ٹال جاتے۔ ان ہی لوگوں نے مجھے کلام حیدری صاحب سے دوری بھی

بنوادی۔ چاپلوس اور امداد کے خواہاں حضرات میرے خلاف ایک محاذ کھول کر میری شکایتیں کرنے لگے۔ کلام حیدری صاحب آخر کاران چاپلوس لوگوں کے جھانسے میں آ گئے اور مجھ سے آہستہ آہستہ دوری بناتے چلے گئے اور پھر ایک دن کلام حیدری صاحب نے مجھ پر مقدمہ دائر کر دیا۔

مجھے تعجب ہوا، لیکن ہمارے شہر (اورنگ آباد) کے رہنے والے بدرالدین بدر صاحب (جنہیں میں بھائی جان کہتا ہوں) نے کلام حیدری صاحب (جوان کے عزیز ترین دوست تھے) کو سمجھا بجھا کر اس مقدمہ کو ختم کرایا۔ اس مقدمے سے پہلے مجھے ''مورچہ''، ''آہنگ''، ''ہند لیتھو پریس'' سے کلام حیدری نے دور کر دیا تھا۔ جب مجھے کلام حیدری صاحب آخری مرتبہ رخصت کر رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ میری بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کلام حیدری صاحب نے دوسری جانب منھ موڑ کر کہا:

''نثار صاحب آپ کو کسی بھی چیز کی کبھی ضرورت پڑے مجھ سے طلب کریں، انشااللہ اسے پورا کروں گا۔ ویسے میں دہلی (نوئڈا) جارہا ہوں۔ ہوسکتا ہے آپ کو یاد کروں، آپ دہلی آنے سے ہرگز انکار نہ کریں۔'' اور پھر وہ بغیر میری جانب دیکھے اپنی آرام گاہ کی جانب چلے گئے۔ میں ہکا بکا سوچنے لگا......

کلام حیدری صاحب کا جس دن انتقال ہوا اس وقت میں ممبئی میں تھا۔ ۳ر فروری ۱۹۹۴ء کی شام میں جمال الدین ساحل کے فون سے معلوم ہوا کہ کلام حیدری صاحب آج انتقال کر گئے۔ صد حیف! ان کے آخری سفر کے وقت میں موجود نہیں رہا۔ کاش......

شاہدہ بھابھی سے ملنے کئی سال بعد خورشید اکبر کے اصرار پر ''رینہ ہاؤس'' جگ جیون روڈ چلا گیا۔ میں نے خورشید اکبر صاحب کا شاہدہ بھابھی سے تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوئیں، لیکن گفتگو کے دوران میری جانب برابر دیکھتے رہیں۔ آخر کار انہوں نے چائے پیش کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا:

''میں آپ کو پہچان رہی ہوں، لیکن......''

میں نے فوراً جواب میں کہا:

''میں نثار احمد صدیقی ہوں......''

''ارے......ارے......آپ''

اور پھر روہانسی آواز میں کہا: ''اتنے دنوں بعد میری یاد آئی؟ اللہ کا کرم ہے کہ خورشید صاحب کے توسط سے آپ کو ایک نظر دیکھ لیا۔''

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں وہاں (رینہ ہاؤس) سے رخصت ہوئے۔ دو سال بعد شاہد اقبال کا میرے موبائل پر فون آیا کہ: ''شاہدہ حیدری اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔'' یہ سن کر کلیجہ منھ کو آیا، لیکن میں کیا کر سکتا ہوں۔ اللہ کا حکم کون ٹال سکتا ہے؟

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ کلام حیدری اور شاہدہ بھابھی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ ❁❁

نہایت ضروری

- ☆ قلم کار حضرات! ''زبان وادب'' کو تخلیقات سے نوازنے کا شکریہ! اکادمی اشاعت یافتہ تخلیقات کا معاوضہ براہ راست آپ کے اکاؤنٹ میں بھیجتی ہے، اس لئے آپ تخلیقات کے ساتھ اپنا وہ نام انگریزی میں ضرور لکھیں جو بینک اکاؤنٹ میں ہے۔ بینک کا نام و پتہ، اکاؤنٹ نمبر اور IFS Code بھی تحریر کریں۔ آپ کا موبائیل نمبر اور مکمل پتہ بھی ضروری ہے۔ یہ تمام تفصیلات نہ ہونے کی صورت میں آپ کی تخلیق پر غور کرنے سے ہم قاصر ہوں گے۔
- ☆ ہمارے کرم فرما حضرات انٹرنیٹ سے اپنی تخلیقات بھیجتے ہوئے بھی مذکورہ باتوں پر دھیان دیں۔ بسا اوقات تخلیق کار نام بھی منسلک نہیں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی اشاعت ممکن نہیں ہو پاتی۔ ازراہ کرم ان گزارشوں پر لازماً توجہ رکھیں۔
- ☆ جو حضرات اب تک مذکورہ تفصیلیں نہ بھیج سکے ہوں، وہ بھی اس اعلان پر نگاہ عنایت فرمائیں۔ شکریہ!

افسانے

احمد صغیر

"Hanif Manzil" Koyli Pokhar, Police Line, Gewali Bigha, Gaya - 823001
(Mob. 9931421834)

برہنہ وجود

پھلوا کے دکھوں کا سمندر کتنا گہرا ہے، کتنا وسیع...... اتنا گہرا کہ ساری دنیا اس میں سما جائے۔

’’ہے بھگوان، ہم نے تیرا کیا بگاڑا تھا......کیا گناہ کیا تھا...... ہم سے کیا پاپ ہو گیا تھا......‘‘ اُس نے آسمان کی طرف دیکھا، لیکن آسمان بالکل شفاف تھا۔ جیسے کوئی پاکیزہ روح، گویا آسمان خود کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا ہو، لیکن زمین تو گنہگار ہے یا زمین پر رہنے والے۔ پھلوا کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ وہ اپنی روح میں جھانکنے کی کوشش کرتی اور جب جب وہ تنہا ہوتی اس کا دل مزید زور زور سے دھڑکنے لگتا، خاص کر جب وہ سونے جاتی، اچانک وہ ایک ہی سوال میں اُلجھ جاتی ـــــ ہم لوگ ادھ ننگے کیوں رہتے ہیں؟ ـــــ استن کو چھپانے کی اجازت کیوں نہیں ہے۔ کس نے یہ اصول بنائے ہیں اور کب تک یہ اونچی ذات والے ہماری چھاتیوں کو دیکھ دیکھ کر مزے لیتے رہیں گے، لیکن پھلوا کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ رسم کب سے رائج ہے، اسے تو پتہ بھی نہیں۔ بس اُس نے اپنی ماں کو بھی نیم عریاں دیکھا تھا اور اپنی برادری کی تمام عورتوں کو بھی، لیکن جب اس کے نقوش ابھر آئے تو اس نے ماں سے کہا تھا:

’’ماں میں اپنی چھاتی کو کپڑے سے ڈھانکنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’نہ بیٹی نا......ایسا گجب نہ کرنا......استن کر (Brest Tax) دینے پڑیں گے۔ ہمارے پاس دینے کے لئے کچھ بھی نہیں ہے۔‘‘

پھلوا آگے کچھ نہ بول سکی۔ اس کے اندر دور تک دھول اُڑنے لگتی ہے۔ گرم اور سیاہ دھول، کہیں یہ سیاہ بگولے اسے اپنے ساتھ دور بہت دور اُڑا کر نہ لے جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو وہ کیا کرے گی۔

ماں ڈرتی کیوں ہے؟ پھلوا نے سوچا۔ ان فرسودہ رسم و رواج سے وہ کب تک بندھی رہے گی۔ کبھی آزاد بھی ہوگی یا دوسری عورتوں کی طرح اسی طرح نیم عریاں رہ کر اپنی زندگی گزار دے گی۔

اُن کی دنیا کتنی خوبصورت ہے۔ حد درجہ حسین اور ہم لوگوں کی دنیا بدصورت، بے حد بدترین۔ پھلوا گھر کے دروازہ کے پاس کھڑی ہوگئی۔ اس نے آسمان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ سیاہ گھٹاؤں کا قافلہ بڑھتا جا رہا تھا، جس کے باعث ساری فضا میں تاریکی کی حکومت ہونے لگی تھی۔ ایسی تاریکی کہ اسے سامنے کا منظر بھی دھندلا نظر آنے لگا۔ وہ اپنی جھونپڑی میں لوٹ آئی اور چراغ روشن کر دیا۔ اب بوندا باندی شروع ہوگی پھر زور سے مینھ برسا، زوروں کی ہوا چلی اور اس کے گھر کا چراغ بجھ گیا۔ جھونپڑی میں ایک بار پھر تاریکی نے اپنی حکومت قائم کر لی، اسی طرح جس طرح پھلوا اور اس کی برادری کی زندگی میں اندھیرا در آیا ہے۔

یہ رسم کس نے بنائی؟ وہ بہت دیر سے اپنے آپ سے پوچھتی رہی، لیکن جواب تلاش کرنے کے لیے اسے برسوں نہیں صدیوں کا سفر طے کرنا پڑا اور جب سفر سے لوٹی تو اس کے ہاتھ خالی تھے، ذہن بھی خالی اور آدھے جسم پر کپڑا بھی نہیں تھا۔ اس نے سوچا آدھا بدن ڈھنکنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا اگر یہ بھی نہیں رہتا تو ہمارا کیا بگڑ جاتا۔ جس طرح میری چھاتی کو دیکھتے ہیں اس طرح نیچے کے حصے کو بھی دیکھ کر مزے لیتے رہتے۔ ہم لوگوں کو ننگا رکھنے کا یہی نا مقصد ہے کہ وہ ہماری چھاتی کو دیکھ کر مزے لیں اور ہم لوگ اس بھاؤنا میں گرفتار رہیں کہ دیکھو تمہاری اوقات یہی ہے۔ ہم نے یہ اصول وضع کیا ہے کہ تمہیں ننگا رہنا ہے۔ اگر کپڑے پہننے کی حماقت کی تو ٹیکس دینا ہوگا۔ وہ بھی چھاتی کے وزن کے برابر اور یہ وزن برہمن اپنے ہاتھوں سے تولیں گے کہ چھاتی کا وزن کتنا ہے اور اسی کے حساب سے ٹیکس لگے گا۔

پھلوا کے اندر کوئی پرندہ پھڑ پھڑاتا ہے۔ پھڑ پھڑاہٹ کی آواز سن کر وہ چونک پڑتی ہے۔ کون سا پرندہ اس کے اندر سما گیا ہے یا اس کا وہم ہے۔ وہاں کوئی پرندہ نہیں، بس پرندے کا تصور ہے۔ نہیں نہیں......کوئی تو ہے اس کے اندر جو آزاد ہونا چاہتا ہے۔ اس نے کب کسی پرندے کو اپنے اندر قید کر لیا۔ ایسا تو اس نے کبھی نہیں کیا۔ پھلوا تو خود ایک پرندہ بن گئی تھی۔ ذہنی غلامی کے پنجرے میں قید۔ پنجرے کا دروازہ ہر وقت کھلا رہتا ہے، پر وہ اڑ نہیں سکتی۔ اس کے پر کتر دیئے گئے تھے۔ رسموں کی ڈور میں بندھی وہ جہاں بھی جاتی، لوٹ کر پھر وہیں آجاتی، جہاں سے سفر شروع کرتی۔ سفر کیا تھا گھر آنگن، گاؤں، ندی اور میدان وہ جہاں بھی جاتی کسی نہ کسی کی نگاہیں اس کا پیچھا کرتیں۔ ندی میں نہا رہی ہوتی تو سورج نمسکار کرتے دو تین پنڈت کبھی سورج کو نمن کرتے کبھی اس کے پستان پر نگاہ کرتے۔ پھلوا اپنے پستان پر نگاہ کرتی۔ پھلوا کے پاس اپنے پستان کو چھپانے کے لئے کوئی کپڑا نہیں ہوتا۔ جو کپڑا ہوتا وہ نیچے کے حصے کو ڈھکنے کے لئے ہی ناکافی ہوتا۔ وہ ہاتھ سے اپنے پستان کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتی۔ وہ جیسے تیسے نہا کر جلدی جلدی تیز تیز قدموں سے گھر کی طرف بھاگتی۔ گھر پہنچ کر قدرے اطمینان محسوس کرتی، مگر وہ گھر کے اندر بھی اپنے پستان کو ڈھانپ نہیں سکتی تھی۔ جب اس کی نگاہ اپنے باپ پر جاتی، خود کو دوسری طرف موڑ کر اپنی پیٹھ باپ کی طرف کر لیتی یا جھونپڑی کی دوسری طرف جا کر خود کو چھپانے کی کوشش کرتی۔

پھلوا چاہتی تھی کہ رسم و رواج کی ساری دیوار توڑ کر باہر آجائے یا رسم بنانے والے کو ایسا سبق سکھائے کہ اسے اپنے آپ پر شرمندہ ہونا پڑے، لیکن جب بھی کوئی قدم اٹھانا چاہتی یا تو اس کی ماں روک لیتی یا باپ منع کر دیتا اور اس کا سارا حوصلہ جھاگ کی طرح بیٹھ جاتا۔

''ایسا کچھ نہ کرنا......یہ اونچی ذات والے ہمیں نہیں چھوڑیں گے......ہمیں ابھی زندہ رہنا ہے۔''

پھلوا کے باپ نے ہاتھ جوڑ دیئے۔

''بابا ہم زندہ کہاں ہیں، ہم تو جانوروں سے بدتر زندگی جی رہے ہیں۔ جب ہم اپنے پورے جسم کو ڈھانپ نہیں سکتے تو ہم میں اور جانور میں کیا فرق ہے۔ وہ بھی ننگے رہتے ہیں اور ہم بھی......''

''بیٹی یہ رسم صدیوں سے چلی آرہی ہے اور کسی نے اس کے کھلاف آواج نہیں اٹھایا۔ سب اسی طرح جینے کے عادی ہیں، تو بھی جینے کی عادت ڈال لے۔''

''بابا اس بُری رسم کے خلاف کسی نہ کسی کو تو آگے آنا ہی پڑے گا تو ہم ہی کیوں نہیں۔ ہوسکتا کہ میری آواج دور تک جاسکے۔''

''بیٹی نہیں......بیٹی تیری آواج دبا دی جائے گی۔''

''میں اپنی جندگی سماپت کر لوں گی۔''

''نہیں بیٹی نہیں......ایسا نہیں کرنا......تو میری اکلوتی بیٹی ہے......تیرے بنا ہم نہیں رہ سکتے۔''

پھلوا خاموش ہوگئی۔ باپ کی بے بسی اور ماں کی ممتا اسے کچھ بھی کرنے سے روک دیتی۔ جس حوصلے سے اس کے اندر احتجاج کے شعلے لپکتے، اسی تیزی سے بابا یا ماں اس شعلے پر اپنے لفظوں یا ممتا کی بارش کر کے اسے بجھا دیتے۔

ایک دن پھلوا بیدرام کی جھونپڑی میں پہنچ گئی۔ ان کی عمر سو سال ہوگئی تھی۔ لاغر، کمزور، ناتواں......آنکھوں کی روشنی بھی لالٹین کی مدھم لو کی طرح ٹمٹماتی رہتی۔ وہ چمار برادری میں سب سے ضعیف تھے۔ دروازہ کھلتے ہی پوچھ بیٹھے: ''کون ہے؟''

''ہم ہیں دادا پھلوا''

''آؤ بیٹی آؤ......بہت دنوں کے بعد ادھر آئی ہے......بتاؤ ماں باؤجی کیسے ہیں؟''

''ٹھیک ہیں دادا'' وہ ان کے قریب ہی کھٹیا پر بیٹھ گئی۔''

''دادا ہم ایک بات جاننے آئے ہیں۔''

''ہاں ہاں، پوچھ بیٹی''

''ہماری عورتیں اپنی چھاتی کو کپڑوں سے کب ڈھکیں گی؟''

بیدرام خاموش ہو گئے۔ شاید اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن اس کا جواب ان کے پاس بھی نہیں تھا۔

''بیٹی ہم کا بتائیں، کوئی کرانتی آئے گی تبھی کچھ بدلاؤ ہو پائے گا، پرنتو ہم کو تو دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے۔''

''اندھیرے سے ہی پرکاس پھوٹتا ہے دادا اور ہمیں وسواس ہے،

پرکاس جرور پھوٹے گا۔ کسی نہ کسی کو اس اندھیرے سے لڑنا ہی پڑے گا۔''

''بھگوان ہی جانتا ہے'' ویدرام سرد آہ بھر کر خاموش ہو گئے۔

پھلوا وہاں سے نکل گئی اور جب رات کو سوئی تو بیدرام کی لاچاری اور بے بسی بھرے جملے یاد آنے لگے۔ وہ بیدرام کے پاس اس لئے گئی تھی کہ شاید ان کے پاس کوئی حل ہو، لیکن انہوں نے بھی چپی سادھ لی تھی۔ وہ رات بھر سوچتی رہی اور نہ جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی۔

پھلوا کے دکھوں کا سمندر کتنا گہرا ہے، کتنا وسیع اور دُکھ کا کوئی انت نہیں ہوتا۔ زندگی ختم ہو جاتی ہے اور دُکھ مرنے کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ مرنے والا چلا جاتا ہے، مگر اس کا دُکھ اس کے پریوار میں منتقل ہو جاتا ہے۔

پھلوا کے سامنے بس ایک ہی سوال منھ بائے کھڑا رہتا۔ اس کا جسم کب پورا ڈھکے گا۔ ڈھکے گا بھی یا نہیں یا دوسری عورتوں کی طرح اس کا بھی نیم عریاں وجود ایک دن ختم ہو جائے گا اور اس کا سماج نہ جانے کب تک اسی طرح نیم عریاں جیتا رہے گا۔ اسے پیاس کا احساس ہوا۔ وہ اُٹھ کر گھڑے کے قریب آئی۔ گھڑے کا ڈھکن ہٹایا اور پانی نکالنا چاہا، لیکن گھڑے میں پانی نہیں تھا۔ اس نے گھڑا اُٹھایا اور ندی کی طرف چل پڑی۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنے پستان کو ڈھکنے کی کوشش کرتی، لیکن وہ اُسے چھپانے میں ناکام رہتی۔ پھلوا ندی کے قریب پہنچ گئی۔ اس کی دو تین سہیلیاں بھی وہاں پانی لینے آئی تھیں۔ اس نے سب کو اسی طرح نیم عریاں دیکھا، پھر بغیر کچھ کہے گھڑے میں پانی بھرا اور گھر کی طرف چل پڑی۔

ابھی وہ آدھے راستے میں تھی کہ سامنے سے دو برہمن آتے ہوئے دکھائی دیئے وہ لوگ دور سے ہی پھلوا کو دیکھ رہے تھے۔ پھلوا نے ایک ہاتھ سے اپنے پستان کو چھپانے کی ناکام کوشش کی کیونکہ دوسرے ہاتھ سے اس نے گھڑا پکڑ رکھا تھا۔ جب دونوں برہمن بالکل قریب آ گئے تو دونوں نے للچائی نظروں سے اس کے پستان کو بغور دیکھا۔ پھلوا کو بہت غصہ آیا۔ اس کا دل چاہا دونوں کی آنکھیں نکال لیں، مگر اس نے غصے کو ضبط کر لیا۔ وہ اسی غصّے کی حالت میں گھر پہنچی۔ ماں اس کا غصہ بھرا چہرہ دیکھ کر ڈر گئی۔

''یہ لڑکی جرور کوئی انرتھ کرے گی۔'' اس نے سوچا، مگر وہ اسے سمجھانے سے قاصر تھی کیونکہ اس کا غصہ آئے دن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

پھلوا کے دُکھوں کا سمندر کتنا گہرا ہے، لیکن آج وہ دکھوں کے سمندر سے باہر نکل آئی تھی۔ آخر کب تک دُکھوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتی۔ دکھوں کے سمندر میں رہتے رہتے اس کا وجود سمندر کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ہمت یکجا کیا اور باہر نکل آئی۔ آج جب وہ اپنے گھر سے باہر آئی تو اس نے اپنے پستان کو کپڑے سے ڈھک رکھا تھا۔ اس کی ماں یہ دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ اس کے پتا نے بھی حیرت سے دیکھا، لیکن سبھی کے ہونٹوں پر جیسے خاموشی کی مہر لگ گئی ہو، وہ پانی کا گھڑا لے کر ندی کی طرف چلی گئی۔ وہاں دو برہمن جو اشنان کر رہے تھے پھلوا کے پستان کو کپڑے سے ڈھکا دیکھا تو حیرت میں پڑ گئے۔ پھلوا گھڑے میں پانی بھر کر گھر واپس آ گئی۔ اس کے پیچھے وہ دونوں بھی اس کے گھر آ گئے اور اس کے پتا سے کہا کہ پھلوا نے اپنے استن کو کپڑے سے ڈھکا ہے، اس لیے اسے استن کر دینا ہوگا۔ بلاؤ اپنی بیٹی کو تاکہ اس کے استن کا وزن کر سکوں اور اس کے برابر ٹیکس لے سکوں۔

پھلوا کا باپ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا: ''اسے معاف کر دیں......نادان ہے ......اب دوبارہ ایسا نہیں کرے گی۔''

ایک برہمن غصّے میں بولا: ''ٹیکس تو دینا ہی ہوگا''

پھلوا اندر برھمنوں کی ساری باتیں سن رہی تھی۔ اس نے ایک لکڑی میں کچھ کپڑے کو باندھ کر اسے جلایا اور دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔ برہمن آگ کی لکاٹی دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے۔ اس نے لکاٹی دونوں کے جسم سے لگایا۔ دونوں پیچھے ہٹے۔ ایک کی دھوتی میں آگ لگ گئی تھی۔ اس نے آگ بجھانے کی کوشش کی۔ دوسرے کے انگوچھے میں آگ لگی۔ اس نے انگوچھا اتار کر پھینک دیا۔ دونوں بھاگنے لگے، پھلوا لکاٹی لے کر اس کے پیچھے دوڑی۔ برہمن آگے بھاگ رہے تھے اور پھلوا ان کے پیچھے۔ دلت ٹولے کی عورت، مرد یہ منظر دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ پھلوا کے لکاٹی کی آگ ہوا کے چلنے سے تیز سے تیز تر ہوتی گئی۔ دونوں برہمن نہ جانے کہاں روپوش ہو گئے تھے، مگر پھلوا کی لکاٹی کی آگ کی روشنی ابھی تک نظر آ رہی تھی۔ ❀❀

ھندی : ڈاکٹر سنتوش دکشت
اردو : ظفر کمالی
Ismail Shaheed (M.M.Colony) Mill Road, Siwan- 841226 (Mob. 09431056963)

بوڑھا آدمی اور بوڑھا کتا

وہ جو لمبی سی پتلی گلی ہے نا، جس کے اندر ایک پرانی مسجد ہے، اسی مسجد کی سیڑھیوں کے نیچے جو چھوٹی سی تکونی جگہ تھی، اسی میں لگانے لگا ہے بوڑھا اپنی دکان۔ اب تو مہینہ بھر ہونے کو آیا ہے۔ جب بیٹے بہوؤں سے روز ہی روٹی پانی کے لیے کچ کچ ہونے لگی تو بڑھیا نے اپنی چاندی کی ہنسلی بیچ کر تھوڑی پونجی جٹائی۔ مولوی صاحب نے ترس کھا کر دس روپے مہینے میں جگہ کرائے پر دے دی۔ بوڑھا تمبا کو، بیڑی، سگریٹ، بسکٹ، صابن وغیرہ بیچنے لگا۔

بوڑھا ایک دم جھرجھرا چکا ہے۔ جوانی میں بہت محنت مشقت کی تھی اس نے۔ ایک نمبر کا ویلڈنگ مستری تھا۔ تین تین بیٹوں کو بھی ولڈر بنا دیا اس نے۔ دو بیٹوں کی شادی کر چکا تھا۔ سوچا تھا، بڑھاپا بیٹوں کے سہارے کٹ جائے گا، مگر دکان پر جو بھی گاہک آتا، بوڑھے کو اس کی سستی کے لیے ضرور پھٹکارتا۔

دمے سے بری طرح مغلوب بوڑھے کا پورا جسم رہ رہ کر دیر تک آہستہ آہستہ ہلتا رہتا ہے اور اس کی سانسیں عجیب سی گھر......ر...... گھر......ر......سوں......سوں......کی آواز کے ساتھ نکلتی ہیں۔

دکان کی بغل میں، مسجد کے دروازے سے کچھ دائیں جانب پرے ایک بوڑھا کتا بھی پسرا رہتا ہے۔ وہ بھی اکثر اپنی ناک سے گھر......ر......گھر......ر......کی آواز یں نکالتا ہے۔ تھوڑی دور کھڑا کوئی شخص یہ تمیز نہیں کر سکتا کہ اس کے کانوں میں پڑنے والی گھر......ر ...... گھر ......ر......سوں......سوں......کی آواز کتے نے نکالی ہے یا بوڑھے نے۔ بوڑھے کو جب بھی فرصت ملتی، وہ میٹھی نظروں سے کتے کی جانب دیکھ لیتا، (روزانہ) ہی پچیس پیسے والے دس پانچ بسکٹ محض اس کتے کی وجہ سے ہی بک جاتے ہیں۔ بوڑھے کی سستی پر لعن طعن کرنے اور اس پر ہنسنے والے لوگ ہی اس بوڑھے کتے سے پوری ہمدردی جتاتے ہیں اور کسی کسی دن اس کی طرف ایک آدھ بسکٹ پھینک دیتے ہیں۔ رات میں سونے کے وقت بوڑھا جب اپنے طور پر لوگوں کے اس سلوک کا تجزیہ کرنے لگتا ہے تو اسے کتے سے جلن بھی ہونے لگتی ہے۔ اگلے جمعے کی ہی بات ہے، وزیر بھائی خورشید کے ابا سے کہہ رہے تھے:

''آپ کو یاد ہے بھائی جان وہ رحمنوا؟ ارے وہی جو مسجد میں جھاڑو بہارو، چراغ بتی کا کام کرتا تھا، وہ بھی فرصت پاتے ہی مسجد کے دروازے پر پسر جاتا تھا، لگتا ہے اسی کی روح سما گئی ہے اس کتے میں۔''

اور پھر وزیر بھائی بیڑی کا ایک بنڈل اور کتے کے لیے ایک بسکٹ خریدتے ہوئے اس پر بڑبڑانے لگے تھے:

''کچھ لوگوں کے پاؤں قبر میں لٹکے ہوتے ہیں، لیکن کمانے کھانے کی ہوس نہیں مٹتی۔ یہی تو وقت ہے چین کی روکھی سوکھی جو ملے، کھا کر اللہ کا نام لینے کا، لیکن اب ان بزرگ کو کون سمجھائے۔ پتا نہیں، سنائی بھی دیتا ہے یا نہیں......؟''

اس دن بوڑھا بڑا ہی بے چین رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی تکلیف بھی کافی بڑھ گئی تھی۔ رہ رہ کر وہ کتے پر ہی بڑبڑاتا رہا:

''یہ سالا حرامی یہاں نہ پسرا ہوتا تو لوگ شاید مجھ سے ہی ہنس کر دو باتیں کرتے، نہ کرتے ہنس کر باتیں، کم از کم اتنا کوستے تو نہیں! ایک میری بھی قسمت بنائی ہے اللہ نے، اس عمر میں بھی ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دو روٹی نصیب نہیں، ایک یہ ہے حرامی کا جنا......کوئی محبت سے بسکٹ بھی پھینکتا ہے اس کے آگے، تو اس قدر سستی سے بدن جھاڑتا ہوا

اٹھتا ہے جیسے دینے والے کا دیا کھا کر اس پر کوئی احسان کرنے جا رہا ہو۔'' بوڑھا اور تیزی سے ھانپنے اور گھر......ر......گھر......ر......سوں ......سوں......کرنے لگا۔

تیسرے پہر جب بڑھیا بازار سے دکان کے لیے سودا لے کر لوٹی تو بوڑھے کی بے چینی بڑھی دیکھی۔ سامان پٹک کر جھٹ چائے بنا کر لے آئی اور چائے کے ساتھ دو ٹکیاں بوڑھے کو نگلوائیں، پھر ساری باتیں معلوم ہونے پر اس نے بوڑھے کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

''دکان جمانی ہے تو چار لوگوں کی باتیں برداشت کرنی ہی پڑیں گی۔ اپنی قسمت کا کھانے لگے ہو، چار پیسے بھی جوڑنے لگے ہو اور پھر اپنوں کی دن رات کی الٹی سیدھی سننے سے تو اچھا ہے کبھی کبھار غیروں کی دو باتیں سہ لو۔ اپنوں کی بات زیادہ گھات کرتی ہے، دوسروں کی تو یوں ہوا میں اڑ جاتی ہے۔''

بڑھیا کی باتوں نے بہت اثر کیا۔ بوڑھے نے بیڑی کی جگہ دکان سے لے کر ایک سگریٹ سلگا لی۔

بوڑھے کی دکان اب کافی جم چکی ہے۔ بڑھیا غضب کی محنتی ہے۔ اس عمر میں بھی ہاٹ بازار سے لے کر چولھا چکی سب دیکھ لیتی ہے۔ بوڑھا تو بس دن بھر بیٹھا بیٹھا بیچ لیتا ہے کسی طرح۔ اس کا کھانا سونا سب دکان میں ہی ہوتا ہے۔ روزانہ رات میں بڑھیا دکان سمیٹ کر اسی میں بوڑھے کا بستر لگاتی ہے۔ صبح بوڑھے کو چائے دے کر وہ پھر سے دکان سجاتی ہے اور تب تک بیٹھی گاہکوں کو نپٹاتی ہے جب تک بوڑھا رفع حاجت سے فارغ نہیں ہو لیتا۔

بلاشبہ بوڑھے کی دکان اب کافی جم گئی ہے، پھر بھی وہ خوش نہیں رہتا۔ کتے کے تئیں بتدریج اس کی نفرت بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ وہ اکثر اکیلے میں بڑبڑاتا ہے:

''ایک میں ہوں، اتنا خوددار کہ آج بھی ہاتھ پاؤں چلا کر کھا رہا ہوں اور یہ ہے......کاہل......دم ہلانے والا! آج میں بھی بیٹوں، بہوؤں کے آگے دُم ہلا سکتا تو کیا مجھے بھی دو روٹی نصیب نہیں ہوتی؟''

اور اس دن تو بوڑھے کو بہت ہی برا لگا۔ حفیظ میاں نے اسی کی دکان سے سگریٹ مانگا اور سلگا کر سامنے سے آ رہے سلیمان کو روک کر کہا:

''یار! ہمارے لونڈے تو اِدھر اُدھر مارے پھر رہے ہیں اور یہ بڈھا آرام سے بیٹھ کر پلاؤ قیمہ اڑا رہا ہے، سالا مرتا بھی نہیں کہ اس کی جگہ میں اپنے بیٹے کو دکان کھلوا دوں'' اور جانے سے پہلے حفیظ میاں نے کتے کے پاس بیٹھ کر اسے دلار کیا اور پھر بوڑھے کو ایک بسکٹ دینے کو کہا۔

بوڑھے کے چہرے کی نسیں پھولنے لگی تھیں، وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا، انسانوں کی بھی عجیب فطرت ہے۔ دم ہلانے والے کتے سے لاڈ کریں گے، مگر اس جیسے کمانے کھانے والے بوڑھے سے ڈھنگ سے بات بھی نہیں کر سکتے اور اوپر سے حسد اور نفرت، دس بیس پیسے اچھال کر اپنی دریادلی کا مظاہرہ کر سکیں......ایسے کہاں؟

تبھی حفیظ میاں نے چلا کر کہا:

''سنتے نہیں ہو بڈھے، ایک پچیس پیسے والا بسکٹ دینا۔''

بوڑھے نے دھیمی، لیکن سخت آواز میں کہا:

''بسکٹ نہیں ہے۔''

''وہ کیا رکھا ہے اس مرتبان میں۔'' حفیظ میاں جھنجھلا اٹھے۔

''پچاس پیسے والا ہے، دے دوں؟''

''اب دے بھی دو......آج برخوردار کی قسمت تیز لگتی ہے۔''

حفیظ میاں کتے کے پاس سے اٹھتے ہوئے دکان کی جانب لپکے اور بسکٹ لے کر کتے کی طرف مڑ گئے۔

بسکٹ دینے اور پیسے سمیٹ لینے کے بعد بوڑھا بڑبڑانے لگا:

''قسمت اس کی تیز نہیں، تم لوگوں کی نظروں میں کھوٹ ہے، ویسے کل تو پتا ہی چل جائے گا کہ کس کی قسمت زیادہ تیز ہے......؟''

اگلے روز سب سے پہلے بڑھیا کی ہی نظر پڑی تھی مرے ہوئے کتے پر۔ بڑھیا نے بوڑھے کو چائے کا گلاس تھماتے ہوئے پوچھا:

''کتا کیسے مر گیا......؟''

بوڑھا خاموش رہا۔

بڑھیا نے پوچھا: ''ادھر جو دو تین مرتبہ چوہے مارنے کا زہر منگوایا تھا تم نے، وہ سب پڑیاں کہاں ہیں؟''

بوڑھا خاموشی سے چائے سڑکتا رہا۔

(بقیہ ص ۷۲ پر)

منظومات

علیم صبا نویدیؔ

تری شان جل جلالہٗ

تو ہر اک سمت ہے جلوہ گر ، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ
تو نفس نفس ، تو نظر نظر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

جو جہانِ غیب وشہود ہیں، ترے آگے سر بہ سجود ہیں
ترے ذکر میں ہے ہر اک شجر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

تو ہر ایک دل کا مجیب ہے ، تو ہر اک نظر کا حبیب ہے
تجھے پھر بھی ڈھونڈے ہے ہر بشر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

تو ہر ایک شئے سے عیاں بھی ہے، تو ہر ایک شے میں نہاں بھی ہے
تجھے دیکھ سکتی ہے کب نظر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

ترے ہاتھ موت وحیات ہے، ترے بس میں قید ونجات ہے
تجھے ذرّے ذرّے کی ہے خبر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

تری رحمتوں سے بھری ہوئی ، تری برکتوں سے لدی ہوئی
مری منزلیں ، مری رہ گزر، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

ذرا دیکھ شہرِ سخن میں اب تری لکھ کے حمد و ثنا عجب
یہ نویدیؔ فن کا ہے تاجور، تری شان جُلّ جَلَالَہٗ

❀❀❀

(صبا کے غنچے، مطبوعہ ۲۰۲۰ء، ص۱۲ سے ماخوذ)

نیازؔ انصاری

Maktaba Wahidiya Razviya, Meena Bazar, P.o. Lohata,
Varanasi- 221107 (Mob. 9696066972)

نعت پاک

کیا جمال مہر و ماہ و کہکشاں
فیض یاب نورِ احمد کل جہاں

ذرّہ ذرّہ حسن سے ہے ضوفشاں
صحرا صحرا ہو گیا ہے گلستاں

تھا وہ مکہ فتنہ و شر کا جہاں
آپ کے دم سے ہوا دارالاماں

حق تعالیٰ آپ پر بھیجے درود
آپ کے مداح سب کروبیاں

چشمہ فیضان جاری کل بھی تھا
آج بھی دریائے رحمت ہے رواں

❀❀❀

کائنات نوریؔ
Dumaria, Maghuli, Gaya - 824221 (Bihar)

الوداع

ہم سے رخصت ہو رہا ہے ماہِ رمضاں الوداع
حق کا مہماں ، مومنوں کی راحت جاں الوداع

کس زباں سے تجھ کو کہہ دیں ماہِ عرفاں الوداع
سال بھر کے بعد ہوگا جلوہ ساماں الوداع

راہ تیری دیکھتی ہوگی نگاہِ روزہ دار
کروٹیں لیتے رہیں گے دل کے ارماں الوداع

جس کے دم سے تازہ دم تھے عفو وبخشش کے گلاب
جا رہی ہے باغ سے فصل بہاراں الوداع

پنج وقتہ وہ نمازیں ، وہ تراویح صیام
تیرے دم سے تھی بہار دین و ایماں الوداع

ہائے وہ پرنور منظر وقت افطار و سحر
لحہ لحہ وقت کا تھا کیف ساماں الوداع

رحمت حق کا سمندر موجزن تھا رات دن
صائموں کی سانس تھی جنت بداماں الوداع

گونجتی تھی خانۂ مومن میں قرآں کی صدا
سن کے سب کی روح ہو جاتی تھی رقصاں الوداع

تیری فرقت ماہ رمضاں ہے بڑی ہی جاں گداز
کیوں نہ روئیں خوں کے آنسو اہل ایماں الوداع

اپنے دامن میں لئے تھا تو شب قدر حسیں
تیرا احساں تھا بڑا ماہِ ذیشاں الوداع

صبر ، غم خواری ، حیا ، پاکیزگی ، فطرہ ، زکوٰۃ
تیرے دامن میں تھی کیا کیا جنس ارزاں الوداع

تیری رحمت دیکھ کر سب کی یہی ہے آرزو
کاش رہتا سال بھر تو ماہِ رمضاں الوداع

داغ فرقت دے کے جاتا ہے ، مگر یہ تو بتا
ہم کہاں سے لائیں گے فرقت کا درماں الوداع

جا خدا حافظ ملے گی تجھ سے باقید حیات
تیری نوریؔ تجھ پہ صدقے تجھ پہ قرباں الوداع

❀❀❀

رباعیاتِ
شفقؔ عمادپوری

عصیاں کی کدورت نہ مٹائی تونے
روزے سے نہ کی دل کی صفائی تونے
آئینے میں منھ دیکھ ذرا اے منعم
بے روزے کی عید کیوں منائی تونے

❀❀❀

ہو عید کا چاند ہر مہینہ ساقی
خالی جائے نہ دور مینا ساقی
دینا ہے ترا کام ، دیے جا بھر کر
پی لوں گا ، مرا شغل ہے پینا ساقی

ڈاکٹر کہکشاں پروین

Iqra Masjid Complex B-5, Main Road, Ranchi - 834001 (Mob. 9608337578)

ایک کمرہ

اکثر! میں نے مانگی ہے یہ دعا
رب دو جہاں سے
اے خدا! اے دو جہاں کے مالک
میں ایک فقیر بندہ ایک حقیر ذرہ، افتاں وخیزاں
ازل سے ناتواں کمزور لرزاں
دوزانو ہوں تیرے آگے
دعا ہے رحم وکرم کی، عفو ومغفرت کی
دعا ہے قبولیت کی، آرزوں کی تکمیلیت کی
نہیں خواہش اونچی عمارت کی
محلوں کی، شان وشوکت کی
پل پل، لمحہ لمحہ جاگتی ہے یہی تمنا
بس ایک کمرہ ہو، ایک کمرہ ہو
اس پورے علاقے میں
اس وسیع وعریض احاطے میں
صرف ایک کمرہ
جہاں میں دیکھوں سب کو شامل
جہاں ہوں سب ایک جماعت میں داخل
جہاں الٹا نہ ہو گنتی کا سفر
جیسے چار تین دو ایک صفر
بالکل سیدھا ہو نمبر شمار
جیسے ایک دو تین چار

اور جاری رہے یہ ترقی مسلسل
ہر برس، ہر ماہ، ہر دن، ہر پل
پھر چھلانگیں ماریں یہ اعداد وشمار
سو دو سو پانچ سو، ہزار
کرسیوں پہ ہوں جو براجمان
دفتروں میں صاحبان ذیشان
سروں میں ان کے ہو سودا اردو کا
پڑھیں وہ ذرا قاعدہ اردو کا
گھر گھر ہو اردو کا رواج
اردو میں ہوں سارے کام کاج
ایوانوں میں یہ باادب عرض ہو
کہ سب کے لئے اردو پڑھنا فرض ہو
دیکھوں کاش وہ خوش کن منظر
آگے بڑھے اردو کا لشکر
اردو جو لشکر کی زباں ہے
اس کی وقعت آج کہاں ہے
کاش کہ ایک کمرہ ہو میرا
جس میں ہو اردو کا ڈیرا
اس کے اندر رات گزاروں
اسی میں ہی میں کروں سویرا

وارثؔ ریاضی

"Kashana-e-Adab" Sikta (Deoraj) P.o. Baswaria, Via. Lauriya,

West Chaparan -845453 (Mob. 8228902548)

غزل

بہاروں کا موسم ہے ، ٹھنڈی ہوا ہے
بہت دل نشیں ، خوبصورت فضا ہے

مرا نغمۂ کیف بارِ تغزل
دھڑکتے ہوئے دل کی رنگیں نوا ہے

چمن میں خزاں کا تسلط ہے ، پھر بھی
تخیل میں ہر شاخِ گل جاں فزا ہے

تصور کا اعجاز اللہ اکبر
کہ وہ خانۂ دل میں جلوہ نما ہے

موبائل کی گل کاریاں اللہ اللہ
کہ حسن نظر ہر بشر کھو رہا ہے

جو صحن چمن میں نہیں کچھ بھی حاصل
تو کوہ و بیاباں میں کیا کچھ دھرا ہے

ڈبو دے گا وہ ساری انسانیت کو
جو بحر تعصب سے طوفاں اُٹھا ہے

سکونِ عبادت نہیں جب میسر
تو پھر کس لئے اس نے پیدا کیا ہے

عجب صورتِ حال ہے آج وارثؔ
کہ ہر ناخدا اب خدا بن رہا ہے

❀❀❀

خوشبو ہی خوشبو

خوشبو بھی اُس کی طرز پذیرائی پر گئی
دھیرے سے میرے ہاتھ کو چھو کر گئی

خوشبو ہے وہ تو چھو کے بدن کو گزر نہ جائے
جب تک مرے وجود کے اندر اُتر نہ جائے

خوشبو بتا رہی ہے کہ وہ راستے میں ہے
موجِ ہوا کے ہاتھ میں اُس کا سراغ ہے

خوشبو تو سانس لینے کو ٹھہری تھی راہ میں
ہم بدگمان ایسے کہ گھر کو پلٹ گئے

خوشبو کہیں نہ جائے ، یہ اصرار بہت ہے
اور یہ بھی آرزو کہ ذرا زلف کھولئے

آج ملبوس میں ہے کیسی تھکن کی خوشبو
رات بھر جاگی ہوئی جیسے دلہن کی خوشبو

پیراہن میرا ، مگر اُس کے بدن کی خوشبو
اُس کی ترتیب ہے ایک ایک شکن کی خوشبو

اس اسیری میں بھی ہر سانس کے ساتھ آتی ہے
صحن زنداں میں اُنہیں دشت وطن کی خوشبو

(سبھی اشعار پروینؔ شاکر کے مجموعہ "خوشبو" سے ماخوذ)

جاوید راناؔ

143/29, Near Char Mazar, Dr. Zakir Hussain Ward, Mominpurah,
Barhanpurah, Madhya Pradesh- 450331(Mob. 9009234875)

غزلیں

چمکنا جا بہ جا اور پھر وہی ظلمات میں رہنا
مقدر جگنوؤں کا ہے اندھیری رات میں رہنا

تو سورج سے الجھتا ہے چراغوں کے سہاروں پر
تری اوقات اتنی ہے تو پھر اوقات میں رہنا

مزاج اپنا سدا رکھتے ہیں پھولوں کی طرح شاداں
ہمیں آتا نہیں تیری طرح جذبات میں رہنا

کبھی میں دھوپ کی بارش کبھی صحرا میں رہتا ہوں
گوارا ہو اگر تم کو میرے ساتھ میں رہنا

بچا لینا زمانے کی بری نظروں سے خود کو تم
مری غزلوں میں چھپ جانا مرے نغمات میں رہنا

ابھی تو اور بہت سے پیچ وخم آئیں گے دنیا میں
ابھی سے تم سلگتے چیختے حالات میں رہنا

بھٹک جائے نہ کوئی بھی مسافر راستہ اپنا
چراغوں کی طرح جلنا اندھیری رات میں رہنا

❁❁❁

صبا بھی مہکے گی رنگ بہار ٹھہرے گا
تم آؤ گے تو دلِ بے قرار ٹھہرے گا

بتوں سے پاک کرو اپنے دل کے تہہ خانے
تب اس مکان میں پروردگار ٹھہرے گا

یہ چاند ساری چمک بھول جائے گا اپنی
تمہاری چھت پہ اگر ایک بار ٹھہرے گا

اے مہ جبیں یہ گلابوں کا سرخ پیراہن
ترے بدن پہ بہت شاندار ٹھہرے گا

وہاں کی خاک سے پھوٹیں گے نور کے چشمے
جہاں جہاں بھی تہجد گزار ٹھہرے گا

یہاں پہ کام نہیں بے وقوف لوگوں کا
یہ میکدہ ہے یہاں ہوشیار ٹھہرے گا

نہ روک پاؤگے اُڑنے سے تم ہمیں راناؔ
فلک پہ جا کے ہی اب یہ غبار ٹھہرے گا

❁❁❁

سلطان مظفر آزاد

Secretary, Bazm-e-Noor, Chaudharana, Ara- 802301 (Mob. 7301916565)

غزلیں

آبرو ممکن نہیں بچ پانا تیرے شہر میں
جینے سے بہتر ہے اب مر جانا تیرے شہر میں

یہ بھی طرزِ زندگی ہے آدمی کا آج کل
ظلم سہ کر مسکرانا ، جینا تیرے شہر میں

دیکھتی ہے ساری دنیا عشق کا کیا تھا وقار
پیار کا بنوا گئے کاشانہ تیرے شہر میں

ہر قدم پہ خوف ہے ، ہر لمحہ دہشت ہے جہاں
اب نہیں ممکن ہے ، میرا جانا تیرے شہر میں

یہ طلسم وقت ہے یا حادثاتِ زندگی
بے خطا لوگوں کا گم ہو جانا تیرے شہر میں

اچھا لکھتا ہے قصیدہ وقت کے حکام کا
خوب ہے آزاد شاعر مانا تیرے شہر میں

❁❁❁

دشمن جو مرا تھا وہ نگہبان ابھی ہے
الجھن میں سمجھتا ہوں مری جان ابھی ہے

مومن ہوں مسلم مرا ایمان ابھی ہے
شاہد ہے خدا سینے میں قرآن ابھی ہے

طوفانِ بلا کہنے کو موقوف ہوا ہے
باقی تو مگر خطرے کا امکان ابھی ہے

جل دے کے نکل جائے وہ دشوار بہت ہے
ہاتھوں میں مرے اس کا گریبان ابھی ہے

اس دورِ پر آشوب میں جینا ہوا دوبھر
ہر آدمی دیکھا ہے پریشان ابھی ہے

مت کھو لیئے آزاد یہ دَر اور دریچے
باہر میں بہت زور کا طوفان ابھی ہے

❁❁❁

اشعارِ زیبا

سجدۂ شکر جفا پر کرنا
اِس کو ہم لوگ وفا کہتے ہیں (رشک لکھنوی)

ہر سمت لطافت ہی لطافت سی لگے ہے
تو ہے تو یہ دنیا مجھے جنت سی لگے ہے (جاں نثار اختر)

یہ بات نرالی دلِ خود دار کرے ہے
تڑپے ہے ، مگر درد سے انکار کرے ہے (حفیظ میرٹھی)

وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے ، پھول کدھر جائے گا (پروین شاکر)

نئی صبح پر نظر ہے مگر آہ یہ بھی ڈر ہے
یہ سحر بھی رفتہ رفتہ کہیں شام تک نہ پہنچے (شکیل بدایونی)

محبت روز پتھر سے ہمیں انساں بناتی ہے
تعصب روز ان آنکھوں پہ پردہ ڈال جاتا ہے (منور رانا)

ڈاکٹر نعیم صباؔ

Mohalla Gulistan, P.o. Phulwarisharif, Patna - 801505 (Mob. 7070000804)

غزلیں

قافیے کی اور نہ تو بحر رمل کی بات کر
چھیڑ اپنا سازِ دل اور تو غزل کی بات کر

مانتا ہوں آئینہ اوروں کو دکھلاتا تھا تو
آج لیکن اپنے کردار و عمل کی بات کر

چاند کی تسخیر تو انساں نے کر لی ہے مگر
مشتری ، مریخ ، زہرہ اور زحل کی بات کر

بادشاہوں کے محل کیا راحتیں دیں گے ہمیں
ہم فقیروں سے فقط دشت و جبل کی بات کر

بات کرتا ہے چمن کے سرخ پھولوں کی صباؔ
مجھ سے تو کیچڑ میں بھی کھلتے کنول کی بات کر

❁❁❁

وہ تخت وہ دربار وہ ہامان نہیں ہے
فرعون سمجھتا تھا کہ بھگوان نہیں ہے

کیوں ڈھوتے ہو رشتوں کو ، نہیں کوئی کسی کا
بس نام ہے اب رشتوں کا ، پہچان نہیں ہے

تم کہتے رہے اور یہی کہتے رہو گے
اشفاق و ظفر کا یہ بلیدان نہیں ہے

اب فرق نہیں باقی یہاں چھوٹے بڑے کا
سوچو تو بزرگوں کا بھی سمان نہیں ہے

کیوں جھوٹ پنپتا ہے زمانے میں صباؔ اب
کیا دل میں کسی کے یہاں ایمان نہیں ہے

❁❁❁

دیاشنکر نسیمؔ کے مطلعے

تکلف نہیں ہم سے زیبا تمہارا
تمہاری ہماری ، ہمارا تمہارا

آن میں حرف نہ آنے دیجئے
جان اگر جائے تو جانے دیجئے

لائے اُس بت کو التجا کر کے
کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

جب نہ جیتے جی مرے کام آئے گی
کیا یہ دُنیا عاقبت بخشائے گی

خم نہ بن کر خود غرض ہو جایئے
مثل ساغر اور کے کام آیئے

ذلت ہے جو پھیلائے بشر پیش بشر ہاتھ
یا رب نہ کبھی ہاتھ کا ہو دست نگر ہاتھ

بتوں کو جو دیکھا گنہ کیا ہمارا
خدائی خدا کی ، تماشا ہمارا

دل سے ہر دم ہمیں آواز بکا آتی ہے
بند کانوں کو بھی گریہ کی صدا آتی ہے

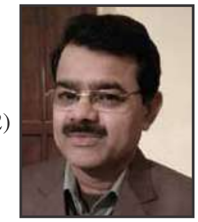

رہبرؔ گیاوی

'Izhar House' Near Anjaan Shaheed, Aabgila, Gaya - 823003 (Mob. 9334754862)

غزلیں

بالیقیں میں خفا نہیں ہوتا
گر غلط تبصرہ نہیں ہوتا

روشنی دے جلا کے گھر اپنا
سب میں یہ حوصلہ نہیں ہوتا

آپ راتوں کی بات کرتے ہیں
اب تو دن میں بھی کیا نہیں ہوتا

آئیں جائیں یہ ان کی مرضی ہے
میرے لب پر گلہ نہیں ہوتا

تونے توڑا ہے اس طرح سے دل
اب کسی پر فدا نہیں ہوتا

❁❁❁

دل جگر جان اور نظر عاشق
جانے کیا کیا ہے آپ پر عاشق

صبح ہو شام یا سحر عاشق
اس کو دکھتا ہے ہر پہر عاشق

تیری باتوں سے پھول جھڑتے ہیں
ہم ہیں تیری زبان پر عاشق

اس کے سائے میں کیوں نہیں بیٹھوں
مجھ پہ جب ہو گیا شجر عاشق

میں جو عاشق ہوا تو کچھ بھی نہیں
تجھ پہ رہبرؔ ہے پورا گھر عاشق

❁❁❁

دیا شنکر نسیمؔ کے مقطعے

بوئے گل غنچے سے کہتی ہے نسیمؔ
بات نکلی منہ سے ، افسانہ چلا

پھل دیا کیا خاک رونے نے نسیمؔ
آنسوؤں سے نخل مژگاں جل گیا

منزل سے دور رکھتا ہے خوابِ سحر نسیمؔ
کھول آنکھ ، دیکھ باندھ چلے ہم سفر کمر

شاگرد خواجہ آتشؔ ہندی جو ہے نسیمؔ
کہتے ہیں پارسی کہ یہ آتشؔ پرست ہے

سرد آہیں بھرتے ہیں جب ہم نسیمؔ
کہتے ہیں وہ ٹھنڈے ٹھنڈے جایئے

دم غنیمت سمجھ ، خبر لے نسیمؔ
سوچ ہے ہے ، تو بے خبر کیوں ہے

ہوتے ہو باغ میں جو غزل خواں تم اے نسیمؔ
خندہ گلوں کو آتا ہے بلبل کے شور پر

اب تو جاتے ہیں اسی گلی میں نسیمؔ
ہو رہے گا جو کچھ مقدر ہے

فوج الفاظ کی بھرتی ہے نسیمؔ
شعر پرگن سے ہیں دیوان بھرے

میر سجاد

Alamgir Nagar Janipur Road, Naya Tola, Phulwarisharif,
Patna (Mob. 9334881557)

غزلیں

جتنی مشہور ہے روشنی شہر کی
اتنی مایوس کن زندگی شہر کی

ایسی مہنگی پڑی دلکشی شہر کی
اپنی ہستی بنی نرتکی شہر کی

گاؤں کی شمع روشن ہوئی تیل سے
اور لہو سے جلے مرکری شہر کی

کرب کی آگ میں دن تو جلتا ہی تھا
اب دہکنے لگی رات بھی شہر کی

چمنیوں کے دھوئیں پر ہی مرکوز ہے
میؔر اس دور میں سانس بھی شہر کی

❁❁❁

دائرہ جو ہے مرے گرد بنا رہنے دے
مجھ کو اے دوست اسی گھر میں چھپا رہنے دے

زخم خوردہ ہی سہی شورِ انا رہنے دے
اپنے احساس میں نشتر کو چھپا رہنے دے

جلتے سورج پہ نہیں پھینک ابھی شام کوئی
اپنے سائے کو ابھی پیچھے لگا رہنے دے

ذوق، مریم ہے اسے جادۂ تسکیں دے دے
نفس ، عیسیٰ ہے اسے سولی چڑھا رہنے دے

اب بھی مرکوز ہے ماحول پہ گدلایا سکوت
میر سجاؔد کو تو نغمہ سرا رہنے دے

❁❁❁

تجنیس سے آراستہ اشعار

تام مماثل	: آدمی کہتے ہیں جس کو ایک پتلا کل کا ہے	پھر کہاں کل اُس کو گر کل ہو ذرا بگڑی ہوئی	(ظفر)
تام مستوفی	: بھیجی ہے مجھ کو شاہ جم جاہ نے دال	ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال	(غالبؔ)
مرکب متشابہ	: فقط موتیوں کی پڑی پائے زیب	کہ جس کے قدم سے گھر پائے زیب	(حسنؔ)
مرکب مفروق	: کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات	یقیں ہے صبح تک نہ دے گی جینے	(ذوقؔ)
خطی	: تلافی ہوگئی عسرت کی عشرت سے زہے قسمت	مبدل ہوگئی آسانیوں سے میری دشواری	(داغؔ)
محرف	: گلے سے لگتے ہی جتنے گلے تھے بھول گئے	وگرنہ یاد تھیں ہم کو شکایتیں کیا کیا	(آتشؔ)
مذیل	: مانگ سے اُس کی مانگتی ہے بھیک	مہ کا کاسہ لئے شب تاریک	(ذوقؔ)
مضارع	: ہو گئے پرسوں کے برسوں تم نہ آئے کیا سبب	آپ نے اچھا کیا وعدہ وفا ، اچھے تو ہو	(ظفرؔ)
لاحق	: ذوق اُس کو خود آرائی سے خود بینی سے شوق	آئینہ زانو پہ ہے زلف معنبر ہاتھ میں	(ذوقؔ)

غزلیں

منوّر داناپوری

Shah Toli, Danapur Cantt., Patna- 801503
(Mob. 8789946411)

نگاہ و فکر فلک پر نئی تلاش میں ہے
نئی صدی کا سخنور نئی تلاش میں ہے

بدل رہے ہیں نظریاتِ شاعری و ادب
ادیب یا کہ ہو شاعر نئی تلاش میں ہے

ستارے چاند پہ آئے گا انقلاب کا دور
اب اس صدی کا سکندر نئی تلاش میں ہے

نظامِ شمسی کی تاریخ بھی لکھیں گے وہی
نگاہ جن کی فلک پر نئی تلاش میں ہے

نہیں غرض اُسے حکمت ، ادب کے شعبے سے
جو ہے عروج کا مظہر نئی تلاش میں ہے

بندھے گا سہرا یقیناً اُسی کے سر پہ تمام
کہ وہ جوان جو اکثر نئی تلاش میں ہے

ادیب و شاعر و نقاد و فلسفی و حکیم
تمام شعبے کا رہبر نئی تلاش میں ہے

نئی صدی میں نیا انقلاب آئے گا
ہر اک نگاہِ منوّر نئی تلاش میں ہے

❀❀❀

جوہی عشرت

At. P.o.- Kalyanpur, P.s.+Dist- Garhwa - 822114)
(Mob. 7061615009)

ہرا جو زخم ہے دل کا وہ بھر کے جاؤں گی
تمام شکوے گلے دور کرکے جاؤں گی

جہاں پہ گھورتی رہتی ہے بس نگاہِ ہوس
میں ایسے شہر میں کیسے سنور کے جاؤں گی

نظر نہ آئے جہاں خواب کی حقیقت کچھ
انہیں کی آنکھوں میں ارمان بھر کے جاؤں گی

جب انتظار کی راہوں میں کھو گئیں آنکھیں
کچھ اور دیر نہیں ، پر ٹھہر کے جاؤں گی

جہاں میں نام رہے گا میرا سدا روشن
جہاں میں ایسا کوئی کام کر کے جاؤں گی

سنا ہے رہتا ہے حسن کے تعاقب میں
سو اس کے شہر سے میں بھی گزر کے جاؤں گی

پکارتا ہے جسے بے قرار دل جوہی
اس کے نام یہ دل، جان کر کے جاؤں گی

❀❀❀

نام کتاب	:	اندر کی آگ (شعری مجموعہ)
شاعر	:	ظفؔر صدیقی
مرتب	:	ظفر انصاری ظفؔر
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
اشاعت	:	۲۰۲۳ء
صفحات	:	۲۹۲ قیمت : ۴۰۰ روپے
مبصر	:	ڈاکٹر عطؔا عابدی

''اندر کی آگ'' کے شاعر ظفؔر صدیقی مخصوص فکر ولہجہ کے سبب منفرد شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ اب تک ان کے تین مجموعہ غزلیات ''لہجہ ہمارا'' (۲۰۰۸ء) ''چہرہ بولتا ہے'' (۲۰۱۸ء) اور ''اندر کی آگ'' (۲۰۲۳ء) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کتابوں کے علاوہ دو نعتیہ مجموعے ''بعد از خدا'' اور ''رسالت مآب'' بھی شائع ہوئے ہیں۔ ''اندر کی آگ'' کے مرتب ظفر انصاری ظفؔر اپنی متنوع شعری و ادبی خدمات کے سبب محتاج تعارف نہیں ہیں۔ ان کی کئی شعری و نثری کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

کتاب کا انتساب ''عظیم آباد کی ادبی فضا'' کے نام ہے۔ انتساب کے بعد ظفؔر صدیقی کے نام سلطان اخؔتر کی پانچ رباعیاں شامل ہیں۔ ان رباعیوں سے ظفؔر صدیقی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلو روشنی میں آتے ہیں۔ مجموعہ میں شامل ہر غزل نو اشعار پر مشتمل اور مطلع و مقطع کے ساتھ ہے۔ کسی غزل میں قافیہ کی تکرار نہیں ہے۔ نظر ثانی اور اصلاح و ترمیم کے بعد ''لہجہ ہمارا'' کی غزلیں بھی زیر نظر کتاب میں شامل ہیں۔ ظفؔر صدیقی ''سخن ہائے گفتنی'' کے عنوان سے ''اندر کی آگ'' پر اپنے احساسات و خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ''لہجہ ہمارا'' کی غزلوں کے تعلق سے لکھتے ہیں:

> ''میں اپنی پرانی غزلوں پر گاہے اصلاحی نظر ڈالتا رہا ہوں اور ان میں ضروری ترمیم بھی کرتا رہا ہوں جس کے باعث ان کے متون کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں، اس لئے ان کو دوبارہ شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔'' (اندر کی آگ، ص ۱۷)

اس ضمن میں کتاب کے مرتب ظفر انصاری ظفؔر، شاؔد اور غالؔب کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ظفؔر صدیقی نے اپنی سابقہ غزلوں کو ترمیم و تنسیخ اور اصلاح و تصحیح کے بعد دوبارہ شائع کر کے بزرگ شعرا کی روایت سے کسب فیض کیا ہے۔'' (اندر کی آگ، ص ۲۱)

ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر نے ''دیباچہ'' کے ذریعہ ظفؔر صدیقی کی شاعری کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالی ہے۔ محسن رضا رضوی اور احمد بدؔر کے مضامین نیز امتیاز وحید کی تحریر (فلیپ) سے بھی ظفؔر صدیقی کی غزلوں کے افکار و اطوار اجاگر ہوتے ہیں۔ غزلوں سے پیش تر ظفؔر صدیقی کے چند قطعات بھی شامل ہیں۔ ان قطعات کے ذریعہ شاعر نے ''اندر کی آگ'' کے تعلق سے اپنی کیفیت و خصوصیت کا واضح اظہار کیا ہے۔

''اندر کی آگ'' ۲۴۰ غزلوں پر مشتمل ہے، جس میں نصف سے زیادہ غزلیں ''لہجہ ہمارا'' کی ہیں۔ ''لہجہ ہمارا'' کی غزلیں یہاں نہ تو سابقہ ترتیب کے مطابق ہیں اور نہ ایک جگہ رکھی گئی ہیں۔ ''اندر کی آگ'' کی پہلی غزل ''لہجہ ہمارا'' کی ہے۔ اس کے بعد نئی غزلیں ہیں پھر پرانی غزلیں اور آخر میں چند نئی غزلیں ہیں۔ نئی پرانی غزلیں الگ الگ نہیں رکھنے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ظفؔر صدیقی کے غزلیہ افکار و اطوار ''لہجہ ہمارا'' سے ''اندر کی آگ تک'' ایک جیسی فضا و ادا کا احساس دلاتے ہیں، لہٰذا شاعر کی محنت و ریاضت سے ترمیم و اضافہ کے بعد ''لہجہ ہمارا'' کی غزلیں اب ''اندر کی آگ'' کی غزلیں ہیں، لہٰذا ''لہجہ ہمارا'' کی طرح ''اندر کی آگ'' کے حوالے سے بھی یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان غزلوں میں جو

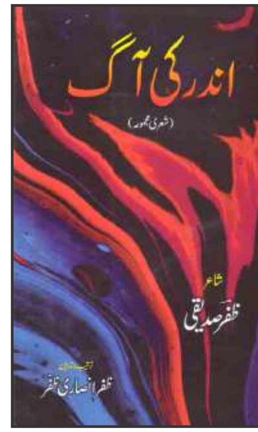

تلخی وتندی اورطنز وبیبا کی ہے، وہ اصلاً سچ کو سچ کی طرح پیش کرنے کی شاعر کی بے تکلف کوشش ہے، ایسی کوشش ہمیشہ بلندآہنگ اورنسبتاً شوخ لہجے پر استوار ہوتی ہے۔ سچ کو سچ کی طرح کھلے انداز میں پیش کرنے کا شعری مزاج شاعر کی اخلاقی جرأت مندی سے مستعار ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''لہجہ ہمارا'' سے ''اندر کی آگ'' تک کا شاعر نہ صرف اپنے معاشرے کی کج رویوں پر نظر رکھتا ہے، بلکہ وہ ان کج رویوں کے خلاف سینہ سپر بھی دکھائی دیتا ہے۔شاعر کی یہ روش احتجاج ومزاحمت کی اس کی حوصلہ بخش صلاحیتوں سے واضح طور پر متعارف کراتی ہے۔

تکلف وتصنع سے پرے ہوکر عصری تلخیوں کا بے ساختہ و بے لاگ اظہار اور ان تلخیوں کے عوامل سے نبرد آزما ہونے کے عزائم و اقدام کی بازگشت سے مملوشاعری اپنا جواز آپ ہوتی ہے۔ممکن ہے بعض لوگ اس جواز کوغزل کی مخصوص نزاکتوں کے تقاضے سے انحراف قرار دیں،لیکن یہی انحراف غزل کی اس خصوصیت کو اجاگر کرتا ہے کہ غزل اپنے جلو میں ہزار صورتوں ،جلووں اور رنگوں کو لے کر چلنے کی قدرت رکھتی ہے۔ظفؔر صدیقی کی غزلوں میں ایسے کئی جلووں اور رنگوں کے حامل اشعار ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ظفؔر صدیقی جیسا عصری معاشرتی اور اخلاقی پستیوں کے خلاف احتجاج ومزاحمت کی راہ دکھانے والا اور اس راہ کی صعوبتوں سے نبرد آزما ہونے کے حوصلے سے سرشار رہنے والا شاعر بھی نرم،لطیف اور شگفتہ احساسات سے یکسر کنارہ نہیں کرتا۔

میں زینہ زینہ نگاہیں بچھاتا رہتا ہوں
وہ دھیرے دھیرے فلک بام سے اترتا ہے

دیکھتا رہتا ہوں آئینے کی صورت اس کو
سجتا رہتا ہے وہ منظور نظر ہونے تک

ہونٹوں پہ تتلیوں سی مچلنے لگی غزل
چہرے دکھائی دینے لگے جب گلاب سے

گزشتہ سطور میں شاعر کے بلندعزم وآہنگ کا ذکر کیا گیا ہے،اس ضمن میں کئی اشعار پیش کئے جا سکتے ہیں،صرف دوشعر دیکھیں۔

ہم اس پتھر کو پانی کر چکے ہیں
یہاں جو روکتا رستہ ہمارا

تیری خاموشی کو سمجھے گا وہ تیری بزدلی
تجھ میں ہمت ہے تو دشمن کو ذرا للکار بھی

احتجاج ومزاحمت کے حوالے سے ظفؔر صدیقی کی نظر اخبارات کے وطیرے پرخوب جاتی ہے۔سماجی منظرنامے میں اطلاعات کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔حق وصداقت پر مبنی اطلاعات اور بیباکانہ طرز وتیور کے بجائے اب اخبارات (میڈیا) کی ترجیحات میں کئی دوسری چیزیں جگہ پا گئی ہیں،اس تعلق سے ظفؔر صدیقی کے اشعار دیکھیں۔

جس میں نہ ہوں ارباب سیاست کے قصیدے
اس شہر میں ایسا کوئی اخبار نہیں ہے

خلاف ظلم لکھنے کی جسارت کون کرتا ہے
بہت بزدل ہمارے شہر کے اخبار والے ہیں

میں نے جانا شہر میں ہے شانتی
جھوٹے اخباروں کی سرخی دیکھ کر

مرچ مسالا تحریروں میں لازم ہے
جھوٹ لکھو ، افواہوں کو اخبار کرو

ظفؔر صدیقی کے احتجاج اور صداقت کے بلند عزائم و دعوے پر طنز کے واضح اطوار ان کی نئی پرانی غزلوں میں یکساں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

احتجاجی فضا اور مجاہدانہ انداز دراصل شاعر کا حق وصداقت پر غیر متزلزل یقین واعتبار ہے۔ یہ یقین واعتبار اسے رجائیت کے مستحکم اور تابناک تیور سے نوازتے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ظفؔر صدیقی کی شاعری اس وصف سے آراستہ ہے۔

ساحل سے تشنہ کام پلٹتی ہے بزدلی
ہمت نچوڑ لیتی ہے پانی چٹان سے

طاقت ہو تو کمزور نظر آتی ہے دنیا
ہمت ہو تو رستہ کوئی دشوار نہیں ہے

کون سی چیز یہاں تم کو نہیں مل سکتی
دل میں پانے کی للک سر میں جو سودا رکھوں

ظفؔر صدیقی ان تمام جذبات کو شعری پیکر عطا کرنا جانتے ہیں جن کا تعلق انسان کے بنیادی تقاضوں و مطالبوں سے ہے۔ انسان کے بنیادی تقاضوں کی تکمیل کا جذبہ ہی شاعر کو احتجاج و مزاحمت کی ترغیب دیتا ہے اور شاعر اس ترغیب کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ ہم عصر موضوعات و مسائل کو اہمیت دیتا ہے اور اپنے جذبوں کا اظہار کھلے طور پر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''لہجہ ہمارا'' سے ''اندر کی آگ'' تک کا شاعر زندگی کی مختلف قدروں کی نمائندگی کرتے ہوئے اظہار و صداقت کو اپنا شعری شعار بناتا ہے۔ سچ کا اظہار اگر فطری انداز میں کیا جائے تو درد و کرب کی صورتیں تیز و تند لہجے میں ڈھل جاتی ہیں اور احتجاج و مزاحمت کا ایک سلسلہ قائم کر دیتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ظفؔر صدیقی کو احتجاج و مزاحمت کا شاعر قرار دینے میں مجھے کل کی طرح آج بھی تردد نہیں ہے۔ ظفؔر صدیقی کی غزلیں بلند آہنگ لہجہ اور برجستگی و روانی کے ساتھ بے لاگ فکری رویے کے سبب بھی یاد رکھی جائیں گی۔ متفرق افکار کے ذیل میں چند توجہ طلب اشعار دیکھیں۔

تم احتیاط سے جینے کی بات رہنے دو
قضا کا تیر نہیں چوکتا نشانے سے

اسے ڈبونے میں لگ جاتا ہے ہر اک انساں
ہمارے شہر میں جو شخصیت اُبھرتی ہے

آپ کی ذہانت پر کون خوش نہیں ہوگا
آپ تو بزرگوں کی خامیاں پکڑتے ہیں

سجاتی ہے لہو سے مانگ اپنی
بہت آگے سیاست جا چکی ہے

ہمارے شہر میں اس پر بھی کوئی داغ نہیں
لہو میں ڈوب گئی جس کی آستیں بہت

''اندر کی آگ'' میں کچھ لفظی تراکیب مروجہ قواعد سے الگ روش رکھتی ہیں۔ شاعر کے تجربے کی یہ صورت گنتی کی چند غزلوں تک محدود ہے، لہٰذا اس پر کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، لیکن کتاب کے مرتب ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر اور کتاب میں شامل مضمون نگار ڈاکٹر احمد بدر کے جو خیالات اس ضمن میں پیش ہوئے ہیں، وہ لسانیات سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے توجہ کے حامل ہیں۔ لفظیاتی سطح پر شکست و ریخت کے رویے کو ڈاکٹر ظفر انصاری ظفؔر نے فیشن زدگی اور بدعت بتاتے ہوئے اسے تخریبی عمل قرار دیا ہے، جب کہ ڈاکٹر احمد بدر نے اس عمل کی حمایت کی ہے۔ دونوں صاحبان نے اس تعلق سے توجیہات پیش کی ہیں۔ بہر کیف، یہ کتاب فرد و معاشرہ سے منسوب مختلف موضوعات و مضامین کی ترجمان ہے اور اس میں سادہ و سہل انداز بیان نیز احساسات و جذبات کی بے تکلف پیشکش قارئین کو نمایاں قدروں سے نوازتی ہے۔ کتاب کی ترتیب اور طباعت عمدہ ہے۔

نام کتاب	:	پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ: شخصیت اور کارنامے		
مصنف	:	رضوان اللہ آروی		
ناشر	:	علامہ قتیلؔ اورینٹل لائبریری و مرکز تحقیق، داناپور		
اشاعت	:	۲۰۲۳ء		
صفحات	:	۸۰	قیمت :	۱۲۰ روپے
مبصر	:	**ڈاکٹر طاہر الدین طاہؔر**		

نیکوکاروں کا ذکر بھی نیکی ہے، یہ ذکر خیر چاہے تقریر اور مجلسی گفتگو میں ہو یا تحریر و تصنیف میں، بہرحال باعث سعادت ہی نہیں، داخل عبادت بھی ہے اور مبارک ہیں وہ افراد جو اس نیک عمل کی طرف رغبت رکھتے ہیں اور نہ صرف پس مرگ اُن شخصیات کی زندگی اور کارناموں سے اپنی موجودہ نسلوں کو آگاہ کرتے اور آئندہ نسلوں کے لئے اسے ایک مفید اثاثہ بنا دیتے ہیں بلکہ حسب مواقع اُن شخصیتوں کو بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ عوام و خواص کے سامنے لاتے ہیں جو بفضل ربی

ابھی زمانے کی زینت اور برکت ہیں۔

اگر غور کریں تو اندازہ ہوگا کہ سوانحی نوعیت کی ایسی مفید مقصد کتابیں دراصل دو قسم کی ہوتی ہیں ایک تو وہ ضخیم کتابیں جو خاص تحقیقی مزاج کے ساتھ مباحثاتی انداز میں لکھی جاتی ہیں اور دوسری وہ مختصر کتابیں جو محض تعارفی مزاج کے ساتھ ابتدائی معلوماتی انداز میں قلم بند ہوتی ہیں اور ہمارے لئے یہ خوشی اور اطمینان کی بات ہے کہ اردو کے سوانحی ادب میں ان دونوں ہی زمرے کی کتابیں نہ صرف مدتوں سے لکھی جارہی ہیں بلکہ حالیہ زمانے میں اس کی طرف توجہ میں نسبتاً تیزی سے اضافہ بھی ہوا ہے۔

دیگر علاقوں اور ریاستوں سے قطع نظر، جہاں تک صوبہ بہار کا تعلق ہے، یہاں کے صوفیائے کرام، علمائے عظام اور معمارانِ علم و ادب پر اس نوعیت کی کتابیں نہ صرف سرکاری اور نیم سرکاری اداروں کے اہتمام سے اشاعت پارہی ہیں بلکہ خانقاہی اور نجی ادارے اور انجمنیں بھی اس کام کی طرف مسلسل متوجہ ہیں۔ اس بات کا ایک تازہ ثبوت پیش نظر کتاب ''پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ: شخصیت اور کارنامے'' بھی ہے جسے جناب رضوان اللہ آروی نے لکھا ہے اور اس میں دورائے نہیں کہ بہت ہی خلوص اور علمی آداب واصول کے ساتھ لکھا ہے۔

جناب رضوان اللہ آروی ہمارے پرانے اور منجھے ہوئے قلم کاروں میں ہیں اور ایک رُخ سے دیکھیں تو کہہ سکتے ہیں کہ یہ مختصر سی کتاب ایک شاگرد کی طرف سے اپنے استاد کے لئے بہترین نذرانہ عقیدت ہے اور دوسرے رُخ سے دیکھیں تو یہ کہنے میں بھی کسی مبالغہ کا احساس نہیں ہوتا کہ اس میں ممدوح کتاب جناب طلحہ رضوی برقؔ کا مختصر سوانحی خاکہ اور ان کی تصانیف کا شذراتی تعارف و تجزیہ نہایت حقیقت پسندی کے ساتھ سپرد قرطاس کردیا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب ''تمہید'' اور ''خاتمہ'' کے درمیان آٹھ عناوین کی حامل ہے جن کے تحت پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی سوانح حیات کے ساتھ ساتھ انہیں ناقد ومحقق، مبصر وشاعر، تقریظ نگار ومترجم اور مرتب کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے اور ان کی خدمات کے مذکورہ سبھی پہلوؤں پر مختصر ترین، لیکن نہایت جامع انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

جناب رضوان اللہ آروی نے کتاب کی ''تمہید'' میں جہاں اپنی طالب علمی کا دور یاد کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ:

> ''استاد محترم ادب وشعر کی روایتی تشریح سے زیادہ طلبا میں ادب کا ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے (اور)...... دوران تدریس طلبا کو ادبی شہ پاروں میں مکمل طور پر INVOLVE کرلیتے تھے، جس کے نتیجہ میں قرأت متن کے دوران طلبا کو فرحت وانبساط کا احساس ہوتا تھا اور اسی لطف ولذت اور INVOLVEMENT کی بدولت تفہیم شعر و ادب کے دروازے خودبخود کھلتے چلے جاتے تھے اور اس پر مستزاد استاد محترم کا رنگ تکلم، جو حرف سادہ کو بھی اعجاز کا رنگ عطا کرتا تھا۔'' (پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، ص ۸ وص ۹)

وہیں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ اس کتاب کا مقصد محض یہ ہے کہ استاد مکرم کی تصانیف، ان کے مقالات اور ان کی دیگر تخلیقات کی جھلکیاں سامنے آجائیں اور یہ آئندہ نسل کو فیض کے اُس منبع و ماخذ تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوں جو بہ فضل ربی ابھی جاری وساری ہے۔

اوراق ''تمہید'' کے بعد زیر نظر کتاب میں حضرت برقؔ کی مختصر ''سوانح حیات''، لکھی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تاریخ ولادت ۲۵ جنوری ۱۹۴۱ء اور جائے ولادت پھلواری شریف ہے۔ ان کے والد حضرت علامہ قائم رضوی قتیلؔ داناپوری صاحب نسبت بزرگ، عظیم المرتبت صوفی اور کئی صوفیانہ کتابوں کے مصنف تھے اور ان کی والدہ حضرت بی بی محمودہ خاتون کا تعلق تصوف کے عظیم صوفی خانوادہ خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف سے تھا۔

اس سوانحی حصہ میں جہاں ایک طرف ضروری سنین اور دیگر متعلقہ تفصیلیں یکجا ہوگئی ہیں، وہیں دوسری طرف یہ بات بھی لائق صد التفات بنتی ہے کہ مصنف نے اس میں نہ صرف اختصار اور وصف مانعیت کا خاص خیال رکھا ہے، بلکہ تفصیل کے جویا حضرات کے لئے ''برق نامہ'' جیسی کتاب کی نشاندہی بھی کردی ہے۔

تمہید وسوانح کے بعد اس کتاب میں ''پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ بحیثیت ناقد'' کے تحت ان کی چار کتابوں یعنی ''غور وفکر''، ''نقد وسنجش''،

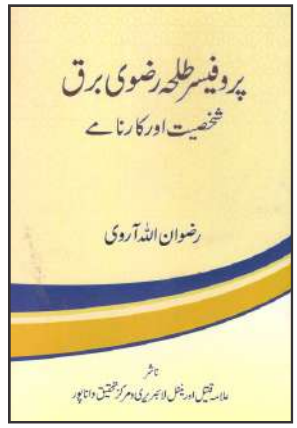

''ارزش ادب'' اور ''ورق ورق آئینہ'' پر قدرے مختصر، لیکن جامع اور معلوماتی شذرات سے قاری کی ضیافت کی گئی ہے، پھر بحیثیت ''محقق'' حضرت برقؔ کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ان کی پانچ کتابوں ''حضرت شاہ اکبر داناپوری: حیات اور شاعری''، ''اردو کی نعتیہ شاعری''، ''گلستان سخن محمودہ'' فارسی کتاب ''سجادہ نشینان بیهار'' اور انگریزی تصنیف "Mysticism in our poetry" کا اجمالی تعارفی، لیکن جامع تذکرہ ہوا ہے جس سے یہ بھی ظاہر ہوجاتا ہے کہ حضرت برقؔ نے اردو کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی زبان میں بھی بحیثیت محقق اپنے پرارزش کارنامے پیش کئے ہیں۔ مذکورہ کتابوں میں پہلی کتاب اُن کے ڈاکٹریٹ کا مقالہ ہے اور فارسی کتاب ڈی لٹ کا مقالہ۔

ناقد و محقق کی حیثیت سے حضرت برقؔ کے تذکرے کے بعد زیر نظر کتاب میں انہیں بحیثیت ''مبصر'' سامنے لایا گیا ہے اور ان کی دو کتاب ''عشرۂ مبصرہ'' اور ''لمحات سرمدی'' کے حوالے سے یہاں برجستہ گفتگو ہوئی ہے، خصوصاً جناب برقؔ کی اول الذکر کتاب کے بارے میں مصنف نے لکھا ہے کہ:

> ''اس کتاب میں شامل تمام تبصرے بے حد جامع ہیں اور اپنی جامعیت کے لحاظ سے طویل بھی ہیں، جن میں متعلقہ موضوع کی روشنی میں تمام مصنفین رشعرا کی فکری و فنی جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پروفیسر طلحہ صاحب کے یہ مفصل تجزیاتی تبصرے بلاشبہ تنقیدی مضمون کے زمرے میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔''
>
> (پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، ص ۴۷ و ص ۴۸)

بعدازیں ''پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ بحیثیت شاعر'' کے زیر عنوان ان کی سات کتابوں ''شایگان''، ''شائع نظمیں''، ''اربعین''، ''عنبر سارا''، ''شہاب سخن''، ''مناصب التواریخ'' اور ''سہرے ہی سہرے'' پر جامع شذرات قلم بند ہوئے ہیں اور مصنف نے مختصر تجزیاتی اظہار کے دوران بہت ہی خوبصورتی اور سنجیدگی کے ساتھ بتایا ہے کہ:

> ''برقؔ کی شاعری کا اصل جوہر ان کی غزلوں میں ہی کھلتا ہے جس میں سوز وگداز قلب کے ساتھ عصری حسیت کی بھرپور تر جمانی ہوئی ہے۔ روایت کے سانچے میں جدید اندازِ فکر کو ڈھال کر برقؔ نے قدیم وجدید کا حسین آمیزہ تیار کردیا ہے۔'' (پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، ص ۵۲)

اتنا ہی نہیں بلکہ اس حصہ میں حضرت برقؔ کی نظمیہ ونعتیہ شاعری اور ان کی رباعی نگاری اور تاریخ گوئی پر بھی ناقدین کے پرمغز تجزیاتی اقوال پیش کردئے گئے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں حضرت برقؔ کی ''تقریظ نگاری'' پر ان کی دو کتابوں یعنی ''میزان قلم'' اور ''تقاریظ'' کے حوالے سے گفتگو آئی ہے اور آخر میں لکھا گیا ہے کہ:

> ''......جس صنف کی کتاب ہو شعر وادب میں اس صنف کی ثروت مند روایت کو اُجالنا پروفیسر طلحہ صاحب کا خاص امتیاز ہے جس کی وجہ سے یکساں صنف پر لکھی گئی کتابوں کے درمیان زیر تبصرہ کتاب کا مقام بھی متعین ہوجاتا ہے۔ اپنے انہیں امتیازات کے سبب (ان کی تقاریظ) لکھنے والوں کے لئے ایک رہنما اصول کی صورت اختیار کرگئی ہے۔'' (پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ، ص ۶۳)

اس کتاب میں بحیثیت ''مرتب'' طلحہ رضوی برقؔ کا تذکرہ تین کتابوں یعنی ''تجلیات قتیلؔ''، ''خورشید سحر'' اور ''ضیاء العروض'' کے حوالے سے ہوا ہے۔ ان میں سے اوّل الذکر کتاب ان کے والد حضرت شاہ محمد قائم قتیلؔ داناپوری کا اردو شعری مجموعہ اور ثانی الذکر کتاب حضرت قتیلؔ کا فارسی شعری مجموعہ ہے اور ثالث الذکر کتاب بھی حضرت قتیلؔ ہی کی تصنیف لطیف ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ کتاب علم عروض کے فنی مباحث سے اپنا تعلق رکھتی ہے۔

اس کتاب میں بحیثیت ''مترجم'' حضرت برقؔ تین کتابوں یعنی ''کشاکش نامہ''، ''مکتوبات جمالی'' اور ''مجمع البحرین'' کے حوالے سے

یاد کئے گئے ہیں۔اس ضمن میں یہ بتایا گیا ہے کہ:

''کشائش نامہ' جیسی مشکل کتاب کا ترجمہ آسان کام نہیں، طلحہ صاحب نے یہ مشکل کارنامہ انجام دے کر کلاسیکی فارسی کے ساتھ مخطوطہ شناسی میں بھی اپنی قدرت و مہارت کا ثبوت دیا ہے......'مکتوبات جمالی' کے رواں اور سلیس ترجمہ کی وجہ سے ان مکاتیب کے مطالب و مفاہیم کی تفہیم بھی آسان ہوگئی ہے اور کہیں پر ترسیل کا کوئی مسئلہ بھی پیش نہیں آتا......'مجمع البحرین' کے ترجمہ کی زبان بھی بے حد رواں، سلیس اور بامحاورہ ہے جس کے سبب نہایت گہرے اور پیچیدہ معانی و مفاہیم کی تفہیم بھی آسان ہوگئی ہے۔''(پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ،ص ۶۸ وص ۶۹ وص ۷۱)

مذکورہ عناوین کے بعد ''خاتمہ'' کتاب گویا عطر بیان کے مصداق ہے جس میں حضرت برقؔ کی بعض تشنۂ طبع تصانیف مثلاً ''آئینۂ تصوف'' (فارسی ڈی لٹ مقالہ کے اردو ترجمہ) ''منتشرات (نظمیہ مجموعہ) اور ''درِ نظامی'' نیز شعرائے داناپور کے تذکرے اور آستانہ چشتیہ نظامیہ کی تاریخ، نیز موقر رسائل و جرائد کے اوراق میں محفوظ متعدد مضامین اور بہت سارے ریڈیائی مقالات، سمیناروں اور کانفرنسوں میں پڑھے گئے مقالات۔اس حصہ میں مصنف نے حضرت برقؔ کی ان تحریروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو مختلف ''انتخابات'' میں شامل ہوئی ہیں اور ان کتابوں کی بھی نشاندہی کی ہے جن میں حضرت برقؔ کا ذکر جمیل ملتا ہے۔

برسبیل تذکرہ یہ باتیں اگرچہ مصنف نے کچھ اعتذار یہ انداز میں لکھا ہے، لیکن بہرصورت ان سے جہاں ان کی عملی انکساری ٹپکتی ہے، وہیں برسرتذکرہ حضرت برقؔ کی خدمات اور ان کی مقبولیت کے تعلق سے معلومات میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔

مزید برآں اس حصہ میں حضرت برقؔ کے اُن فارسی مقالات کی اشاعتی تفصیل بھی ہے جو ہندوستان، پاکستان اور ایران کے ادبی و علمی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں، مگر کتابی صورت میں اب تک مرتب نہیں ہو سکے ہیں۔جناب رضوان اللہ آروی نے کتاب کی آخری سطروں میں بالکل ٹھیک لکھا ہے کہ:

''عظیم آباد کے فارسی اساتذہ میں ایسی کثیر الجہت شخصیت کی نظیر کم ملے گی جو بیک وقت محقق بھی ہو اور ناقد بھی، شاعر بھی ہو اور مبصر بھی، تقریظ نگار بھی ہو اور مترجم بھی، ماہر عروض بھی ہو اور تاریخ گو بھی، اردو فارسی کے قدیم و جدید ادب کا بھی رمز شناس ہو اور فارسی کی صوفیانہ شاعری کے منظر و پس منظر کا تجزیہ نگار بھی۔''

(پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ،ص ۷۵)

مصنف نے اس کتاب کو حضرت برقؔ کی علمی و ادبی شخصیت کا ''ایک ہلکا سا اشاریہ'' قرار دیا ہے تو اس میں بہر حال دورائے نہیں ہو سکتی، لیکن جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ ہلکا سا اشاریہ بھی ''منابع و مصادر'' کی شکل میں ۳۲ کتب و رسائل کی اشاعتی تفصیلوں سے مزین ہے تو پھر ہمیں بہرصورت ''بقامت کھتر بقیمت بھتر'' کی کہاوت یاد آ ہی جاتی ہے۔

اس کتاب کی زبان نہ صرف یہ کہ نہایت سہل اور سریع الفہم ہے بلکہ اس میں علمی سادگی کا وصف بھی نمایاں ہے، یہاں صرف اختصار بداماں جامعیت ہی نہیں بلکہ احتیاط بداماں مانعیت بھی ہے اور یوں خالص علمی مزاج و منہاج کے ساتھ اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے کہ اس میں جو کچھ ہے وہ بس بصورت تحریر ہے اور بہ خامہ مصنف۔یہاں نہ تو ممدوح کتاب کی تصویر ہے اور نہ ہی مصنف کتاب کی تصویر یا ان کا شناس نامہ یا کتاب پر بقلم دیگراں کوئی تاثراتی تحریر۔

مذکورہ صورت حال کتاب کی وہ صوفیانہ سادگی دکھا رہی ہے جو صرف اصل مطلب کی پیش کش محبوب رکھتی ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ اپنی ان خوبیوں سے بہرصورت یہ کتاب اہل ذوق کو متوجہ کرے گی۔

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ کی شخصیت اور کارنامے پر لکھی گئی اس کتاب کی قیمت کچھ زیادہ ضرور لگتی ہے، لیکن اس کے باوجود توقع ہے کہ یہ خرید کر پڑھی بھی جائے گی اور پڑھنے والوں کو حضرت برقؔ کے بارے میں مزید پڑھنے اور جاننے پر مہمیز بھی کرے گی اور کسی عطار کے کہے بغیر اس مشک کی خوشبو یعنی حضرت برقؔ کی علمی شخصیت اور ان کے شاگرد رشید مصنف کتاب جناب رضوان اللہ آروی کی مخلصانہ محنت کا ہمہ طور معترف بھی بنائے گی اور ممنونِ قلم بھی۔

نام کتاب	:	کلیم الدین احمد
مصنف	:	ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی
ناشر	:	اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ
صفحات	:	۱۲۰
مبصر	:	**ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی**

سرزمین بہار ادبی جغرافیہ میں اپنے شاندار اور باوقار ماضی کے ساتھ حال میں بھی اپنی مستحکم علمی اور ادبی روایات کی بنا پر توجہ کا مرکز رہی۔ علمی، ادبی، فکری اور سیاسی حلقوں میں یہاں سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کی تاریخ سنہرے حرفوں میں رقم کئے جانے کے قابل ہے۔ اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار نے گزشتہ دنوں یہاں کے اکابرین ادب پر ''فردنامہ'' کی اشاعت کا جو سلسلہ شروع کیا تھا، زیرنظر کتاب ''کلیم الدین احمد'' اسی سلسلہ کی چوتھی کڑی ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ ''فردنامہ-۴'' ہمارے جانے پہچانے قلم کار ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے مونوگراف کے اصول وضوابط کے مدنظر بڑی دلجمعی اور سنجیدگی کے ساتھ لکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ کلیم الدین احمد جیسی کثیرالجہات شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر ان محدود صفحات میں تفصیلی اور تنقیدی گفتگو نہیں کی جاسکتی تھی، اس لئے ڈاکٹر اعظمی نے اپنے ''ابتدائیہ'' میں قارئین کے لئے یہ وضاحت پیش کردی ہے کہ:

> ''زیرنظر کتاب ایک مونوگراف ہے، کوئی تفصیلی اور تنقیدی کتاب نہیں۔ مونوگراف کے اپنے حدود ہوتے ہیں۔ اس کا مقصد شخصیت اور اس کے ادبی وعلمی کارناموں کا تعارف محض ہوتا ہے، اس میں تفصیلی تنقیدی مباحث قائم کرنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔'' (کلیم الدین احمد، ص۱۰)

درج بالا وضاحت اپنی جگہ، لیکن اس مونوگراف کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ کتاب ادب کے عام طلبا وطالبات کے ساتھ خصوصاً ریسرچ اسکالرز کے لئے کلیم فہمی میں بے حد مددگار ثابت ہوگی، کیونکہ اس کتاب میں وہ تمام نکات اس سلیقے سے پیش کئے گئے ہیں، جو کلیم الدین احمد جیسی شخصیت کے افکار ونظریات کو سمجھنے میں رہنما بنتے ہیں۔

''ابتدائیہ'' سے قبل امتیاز احمد کریمی اور اسلم جاوداں کے رسمی تاثرات بھی شامل کتاب ہیں۔ بعدہٗ سات مخصوص عنوانات کے تحت گفتگو کا باقاعدہ آغاز ہوا ہے اور پھر ''نمونۂ نثر'' و ''نمونۂ نظم'' کے بعد یہ کتاب اختتامیہ اور ''کتابیات'' تک پہنچی ہے۔

کلیم الدین احمد کے افکار ونظریات اور ان کے دہکتے ہوئے جملوں اور دل خراش لہجے نے ایوان تنقید میں جو ہنگامہ برپا کیا تھا، اس کے حال واحوال بہرصورت کسی سے مخفی نہیں۔ اس ہنگامی فضا نے انہیں ایک طرف شہرت بخشی تو دوسری طرف ان کی ادبی شخصیت متنازعہ بھی بنتی چلی گئی۔ ان کے تنقیدی رویے پر خوب بحثیں ہوئیں اور خوب خوب اختلافات بھی ہوئے، لیکن ان سب کے باوجود کلیم الدین احمد کی ذہانت و فطانت اور ان کے نظریات کو تسلیم کیا گیا۔ ان کی کتابوں کو پہلے بھی پڑھا گیا اور آج بھی ادب شناس طبقہ ان کی کتابوں سے استفادہ کر رہا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کیمبرج یونیورسٹی کے تعلیمی ماحول اور انگریزی کے مایہ ناز ناقد ایف۔ آر۔ لیوس کی شرفِ شاگردی نے کلیم الدین احمد کے تنقیدی مزاج کو فکری شعور عطا کیا، لہٰذا ان کے یہاں مغربی تنقید کے اثرات صاف صاف دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں انگریزی نقاد کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے جو وضاحتیں پیش کی ہیں ان کا لب لباب کچھ اس طرح ہے:

(۱) عملی تنقید، تاریخی شعور، روایت کا تحفظ، شاعری اور سائنس، اخلاقیات اور فن وغیرہ کے متعلق ایف آر لیوس کے نظریات کا عکس بھی کلیم الدین احمد کی تحریروں میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے، اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ کلیم الدین احمد کی تنقید اور افکار کو ایف آر لیوس اور ان کی تحریروں نے بہت متاثر کیا ہے۔

(۲) کلیم الدین احمد، رچرڈز کے نظریاتی اور عملی طریقہ نقد سے متاثر ہیں، مگر اپنی تنقید کو نفسیاتی بے اعتدالیوں سے بچالیتے ہیں۔

(۳) تنقید، شعر، الفاظ، اسلوب، وزن، آہنگ، لہجہ وغیرہ کے متعلق ایلیٹ کے خیالات سے کلیم الدین احمد خاصے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے تجزیاتی طریقہ نقد اور کم لفظوں میں بڑی بات کہنے کے

ہنر پر بھی غور کیا جائے تو واضح طور پر ایلیٹ کے اثرات دکھائی دے جاتے ہیں۔

شخصیت وسوانح اور ادبی افکار ونظریات پر گفتگو کے بعد زیر نظر کتاب کا تفصیلی حصہ ''کلیم الدین احمد کی تنقیدی خدمات'' کے عنوان سے سامنے آتا ہے۔ یہ حصہ اس لئے بھی اہم ہے کہ یہاں کلیم الدین احمد کے نمائندہ شناخت نامے ''اردو شاعری پر ایک نظر''، ''اردو تنقید پر ایک نظر''، ''اردو زبان اور فن داستان گوئی''، ''تحلیل نفسی اور ادبی تنقید''، ''سخن ہائے گفتنی''، ''عملی تنقید''، ''ادبی تنقید کے اصول کے ساتھ''، ''اقبال ایک مطالعہ''، ''قدیم مغربی تنقید'' اور ''میر انیس'' جیسی کتابوں پر کہیں تفصیل سے اور کہیں اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے، نیز کلیم الدین احمد کے جارحانہ تنقیدی مزاج کے اسباب، مطالعاتی ذوق اور دیگر زبانوں کے ادب سے ان کی گہری دلچسپی کے وجوہات بھی قلمبند کئے گئے ہے۔ ساتھ ہی کلیم الدین احمد کی تنقیدی آرا کو نری مغرب زدگی اور نوآبادیاتی جبر کا نام دینے والے ناقدین کے لئے ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کی یہ رائے بھی اہم معلوم ہوتی ہے کہ:

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ کلیم الدین احمد کا معیار نقد مغربی ہے، مگر اسی مغربی معیار سے انہوں نے جو اردو شعر ونقد کے اصول ترتیب دیے اس سے اختلاف کی گنجائش، بمشکل نظر آتی ہے۔ ان کا مقصد اردو ادب کی تذلیل نہیں ہے، بس وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمارا اردو ادب بھی مغربی ادب کا معیار حاصل کرلے۔'' (کلیم الدین احمد، ص ۱۰۹)

پروفیسر کلیم الدین احمد کی تنقیدی خدمات کے علاوہ ان کی تحقیقی کاوشات کا بھی زمانہ ہمیشہ معترف رہا ہے۔ اس میں کیا شک کہ ایک غضب کا تنقیدی شعور رکھنے والے مزاج نے اپنی تحقیقی نگارشات سے ارباب علم و ادب کو اپنا گرویدہ بنایا اور غور وفکر کے نئے باب وا کئے۔

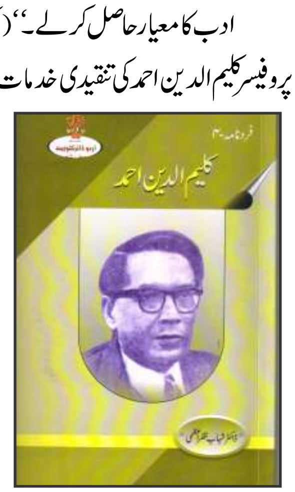

زیر نظر کتاب کے اس حصے میں کلیم الدین احمد کی تمام تحقیقی کتابوں کا نہایت جامع انداز میں جائزہ پیش کیا گیا ہے جس سے کلیم الدین احمد کی محققانہ جہتیں کھلتی نظر آتی ہیں۔ بقول ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی:

> ''کلیم الدین احمد کے یہاں جہاں تنقید کی ساری صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں، وہیں تحقیقی اوصاف اور ہنرمندیوں سے بھی وہ پوری طرح نوازے گئے تھے، چنانچہ انہوں نے نہ صرف یونیورسٹی میں اعلیٰ اور معیاری تحقیق کو فروغ دیا، بلکہ 'تذکرۂ شورش'، 'تذکرۂ عشق'، 'تذکرۂ گلزار ابراہیم'، 'کلیات شاد'، 'دیوان جوشش' اور تین تحقیقی مقالات وغیرہ سے عمدہ تحقیق کا ایک معیار بھی قائم کیا...... انہوں نے نسخوں کی تصحیح اور اشاعت میں جس ریاضت، محنت اور ایمانداری کا ثبوت دیا ہے، وہ ان کی تحقیقی اصولوں سے واقفیت کا بین ثبوت ہے۔'' (کلیم الدین احمد، ص ۷۱ وص ۷۶)

''کلیم الدین احمد کی شاعری'' کے زیر عنوان ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی نے ان کے دونوں مجموعوں یعنی ''۴۲ نظمیں'' اور ''۲۵ نظمیں'' کی روشنی میں ان کے غیر روایتی لہجے کو پرکھتے ہوئے جو تاثرات پیش کئے ہیں، وہ کلیم الدین احمد کے شعری مزاج سے واقفیت کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اعظمی رقم طراز ہیں کہ:

> ''کلیم الدین احمد کے دونوں شعری مجموعوں کی پہلی انفرادیت ان کی جدت طرازی ہے۔ یہ جدت طرازی فکری اور اسلوبی دونوں سطحوں پر نمایاں ہے۔ اول یہ کہ انہوں نے کوئی دیباچہ نہیں لکھا جو ان کی شاعری کی تفہیم میں معاون ہوتا۔ دوم انہوں نے نظموں کا عنوان مقرر نہیں کیا کہ عنوان سے ہی مرکزی خیال کی جانب اشارہ ہو سکے۔ سوم عام طور پر دوسرے شعرا کے مصرعوں یا شعروں کو نظم کا حصہ بنا لیا گیا اور وہ بھی 'واوین' کے بغیر، چہارم یہ کہ انہوں نے مغربی شعرا مثلاً ورڈز ورتھ، ہارڈن اور براؤننگ کی نظموں سے خوب خوب استفادہ کیا اور مضامین، علامات، الفاظ کی سطح پر نئے نئے نقش ابھارے

......موضوعاتی سطح پر کلیم الدین احمد کی نظموں میں تنوع اور رنگارنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔ کہیں واردات قلبی کا بیان ہے تو کہیں عالمی تغیرات کا، کہیں عشق کی شہوانیت اور بوالہوسی ہے تو کہیں حسن کی ابدیت، کہیں وصال کی تپش، دل کی بے قراری ہے تو کہیں فراق زدہ عاشق کی دیوانگی،......ذات حق کی تلاش اور خدا کا ارتقا پذیر تصور بھی کلیم الدین احمد کے محبوب موضوعات کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ اسلوبی سطح پر کلیم الدین احمد کے یہاں جدت اور تجربے کا حصہ کم ہے۔ وہ روایتی اور علامتی دونوں قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ ساتھ ہی مقامی اور ہندی الفاظ وتراکیب برتنے سے بھی احتراز نہیں کرتے۔ اساطیری اور دیومالائی عناصر بھی ان کی نظموں کا حصہ بنتے ہیں۔'' (کلیم الدین احمد، ص ۸۱)

کلیم الدین کی تنقیدی، تحقیقی اور شعری خدمات کے علاوہ اس کتاب میں کلیم صاحب کی دیگر ادبی خدمات مثلاً ''گل نغمہ'' کی ترتیب وتہذیب ''اپنی تلاش میں''، ''میری تنقید ایک باز دید''، ''میرانیس''، معاصر کے مضامین اور تبصرے "Idols" ''جامع انگریزی اردو لغت''، ''دیوان جوشش''، ''کلیات شاد'' اوران کے مختلف مضامین وتبصرے پر اہم معلومات قارئین تک پہنچادی گئی ہیں۔

کتاب کے آخری تیس صفحات میں کلیم الدین احمد کے نثری اور شعری نمونوں کے ساتھ ممتاز وموقر ناقدین ومحققین کے تاثرات بھی درج کئے گئے ہیں اور کلیم الدین احمد کی بارہ تصانیف کے ساتھ ساتھ چودہ دیگر تنقیدی کتابوں پر محتوی ''کتابیات'' نے بھی جگہ پایا ہے۔

زیر نظر کتاب میں پیش کردہ مواد کی خاص اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ یہاں ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کا بیانیہ انداز ادق نہیں بلکہ وضاحتی اور تشریحی ہے جس سے کتاب کی جاذبیت اور معنویت یقیناً دوبالا ہوگئی ہے۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کتاب ایک مونوگراف ہے اور اس انداز کی مختصر کتابیں فطری طور پر قارئین کی دلچسپی کو مہمیز کرتی ہیں، لہٰذا طلبہ وطالبات اس کتاب سے خوب خوب استفادہ کرسکتے ہیں۔

نام کتاب	:	ناظم میواتی سہسرامی: فن اور شخصیت	
مصنف	:	ڈاکٹر محمد صلاح الدین	
ناشر	:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی	
اشاعت	:	۲۰۲۳ء	
صفحات	:	۲۳۶	قیمت : ۳۰۰ روپے
مبصر	:	**اشفاق عادل**	

پیش نظر کتاب ''ناظم میواتی سہسرامی: فن اور شخصیت'' ڈاکٹر محمد صلاح الدین کی گراں قدر تصنیف ہے جو ناظم میواتی سہسرامی کی حیات وخدمات پر مشتمل ہے۔ ناظم میواتی سہسرامی گلشن سہسرام کے وہ گل سرسبد ہیں جن پر اہل سہسرام خصوصی طور پر اور عمومی طور پر اردو دنیا یقیناً فخر کرسکتی ہے۔ انہوں نے نہ صرف شاعری میں اپنے بہترین نقوش چھوڑے ہیں، بلکہ نثر میں بھی ان کے کئی رشحات قلم یادگار ہیں۔ مولانا حاذق ضیائی کی زبانی ان کا ایک خوبصورت تعارف ملاحظہ فرمائیں:

''ناظم فطری اعتبار سے ایک آرٹسٹ ہیں۔ شکلاً اور سنداً تو وہ مولانا ہیں اور ہیڈ مولوی، لیکن ان کی زندگی کا ایک رنگ مشائخ بھی ہے، مگر اصلاً ان کی شخصیت اور مولویت کے پردے میں ایک آرٹسٹ چھپا ہوا ہے۔ بے حجاب، بے تکلف، ہوش مند کوئی انسان ہوسکتا ہے تو یہی ناظم میواتی ہیں۔ جھومتے جھامتے راہ چلتے (ٹوپی اور شیروانی میں) اس میواتی نسل کو آپ پہچان لے سکتے ہیں۔ مختصر یہ ہے کہ یہ اپنے چمن کا گل تنہا، جس کی ہر پنکھڑی میں ماضی کی رعنائی ہے اور عصری تقاضے کی شادابی بھی۔ ان کی زندگی کو ان کے تمثیلاتی خاکے میں دیکھئے کہ بہ انداز غالب کیا گل کھلائے ہیں، جس میں ان کی زندگی کا اصل پیکر بھی پنہاں ہے۔'' (ناظم میواتی، ص ۱۹)

ناظم میواتی سہسرام میں یکم فروری ۱۹۲۵ء کو محلّہ میواتی ٹولہ میں پیدا ہوئے اور یہیں اپنے آبائی مکان میں ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء کو آخری سانسیں لیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ ناظم میواتی صاحب مشرقی تہذیب وشرافت کی جیتی جاگتی

تصویر تھے تو مطلقاً غلط نہ ہوگا۔

فاضل مصنف نے کتاب کا انتساب والدین کے نام کیا ہے جن کی دعائیں ان کے لئے سرمایۂ حیات ہیں۔ ''تعارف'' کے تحت ڈاکٹر محمد صلاح الدین نے کتاب کی وجہ تالیف بیان کی ہے اور تمام ابواب کا مختصراً تعارف بھی پیش کیا ہے۔ مصنف نے کسی اور قلم کار سے کوئی پیش لفظ یا مقدمہ نہیں لکھوایا ہے۔

زیر نظر کتاب پانچ ابواب اور اس کے بعد نہایت وقیع ''محاکمہ''، پر مشتمل ہے۔ باب اول کے تحت انہوں نے ناظمؔ میواتی سہسرامی کی زندگی اور ان کے خاندانی پس منظر پر قلم اٹھایا ہے۔ ناظمؔ صاحب مرحوم کے اجداد کا تعلق میوات سے تھا جو وہاں سے ہجرت کر سہسرام میں آباد ہوئے اور انہیں کے نام پر محلے کا نام میواتی ٹولہ پڑا۔ ناظمؔ صاحب سہسرام کے ایک مشہور بڑے جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی جاگیر از چناری تا رہتاس ۳۸۴ موضع پر مشتمل تھی، لیکن زمانے کی کروٹوں نے جیسے کئی جاگیرداروں کو زیروزبر کردیا اسی طرح ناظمؔ میواتی کے خاندان سے بھی شان وشوکت جاتی رہی۔

فاضل مصنف نے ناظمؔ میواتی سہسرامی کے بارے میں مزید بتایا ہے کہ وہ بچپن سے ہی ذہین تھے اور بلا کی قوتِ حافظہ کے مالک تھے۔ وہ ابتدائی تعلیم کے لئے ''مدرسہ خیریہ نظامیہ'' سہسرام میں داخل ہوئے۔ بعدازاں ''مدرسہ خانقاہ کبیریہ''، سہسرام سے تعلیم حاصل کی اور آگے چل کر ایس ٹی سی، ڈپلوما اِن ٹیچنگ بی اے (پرنسپل اردو) جیسی جدید تعلیمی ڈگریاں بھی حاصل کیں۔ ''مدرسہ خیریہ نظامیہ'' میں جہاں اس کے بانی مولانا فرخند علی فرحتؔ اور مولانا ضیاء الحسن ضیاؔء سہسرامی جیسے جید عالم ان کے استاد تھے، وہیں خانقاہ کبیریہ میں بھی اُس زمانے کے جید علما سے عربی وفارسی اور دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ یہاں انہیں کیفؔ سہسرامی کی رفاقت میسر آئی۔ کیفؔ سہسرامی نے آزادی ہند سے ذرا قبل ناظمؔ میواتی سہسرامی کے اشتراک سے ماہنامہ ''مفکر'' بھی نکالا تھا جس کے دو ہی شمارے منظر عام پر آسکے۔

باب اوّل میں فاضل مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ ناظمؔ سہسرامی کو شعروادب اور تصنیف وتالیف پر نہ صرف دستگاہ حاصل تھی بلکہ ان کو تصوف میں بھی درک تھا اور وہ حضرت شاہ امیر الدین سہسرامی کے خلیفہ مجاز سید خلیل الدین عنبر مجددی مقیم ڈہری اون سون سے بیعت تھے۔ تعلیم کے حصول کے بعد وہ مختلف مدارس واسکول سے گزرتے ہوئے آر آر ایچ ایس اسکول سورجپورہ، رہتاس سے ۱۹۴۸ء میں وابستہ ہوئے اور یہیں سے ۱۹۸۹ء میں ہیڈ مولوی کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوئے اور باقی زندگی اپنے بزرگوں کے بسائے محلّہ میواتی ٹولہ میں گزاری۔

زیر نظر کتاب کے باب دوم میں ''تاریخی شہر سہسرام کے ادبی پس منظر'' کے تحت یہاں پرورش پانے والی نثر نگاری اور شعری کاوشوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ذیل میں سہسرام میں پائے جانے والے نثر ونظم کے اوائلی نمونوں کے ساتھ ساتھ عصر حاضر تک کے ادبی سفر کا ذکر ہوا ہے۔

تیسرے باب ''ناظمؔ میواتی سہسرامی اور چند مشہور معاصرین سہسرام'' کے ذیل میں خصوصی طور پر چھ شعرائے سہسرام، مانوسؔ سہسرامی، کیفؔ سہسرامی، سلطان اخترؔ، ظفرؔ رضوی کاکوی، حاذقؔ ضیائی سہسرامی، مولانا محمود الحسن محمودؔ سہسرامی کا تفصیلی ذکر آیا ہے، حالاں کہ اس باب میں چند اور شعرا کا بھی ذکر کیا جاسکتا تھا جنہوں نے شعروسخن میں اپنا نام روشن کیا ہے، مثلاً مہجورؔ شمسی، سیفؔ سہسرامی، نازشؔ سہسرامی، پروفیسر شمسؔ شیدائی، ڈاکٹر شعیب راہیؔ، حکیم قمرؔ نعمانی، حشرؔ سہسرامی نیز بیرون سہسرام سے بھی چند اہم شعرائے بہار کا ذکر ہوسکتا تھا، مگر معلوم نہیں کیوں اس تعلق سے چند کلیوں پر ہی قناعت کرلیا گیا ہے۔

باب چہارم ''ناظمؔ میواتی سہسرامی کی شعری خدمات'' کے تحت ان کی غزل گوئی، نظم نگاری اور نعتیہ شاعری پر فاضل مصنف نے بحث کی ہے اور ان کے شعری محاسن پر روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے

دو شعری مجموعے ''دل ونظر'' (۱۹۷۹ء) اور ''چراغِ زار'' (۱۹۹۲ء) منظر عام پر آکر خراج تحسین وصول کرچکے ہیں۔ سورجپورہ جیسے دور افتادہ علاقے میں اور سہسرام جیسے ادبی مرکز سے دور رہنے کا غم

انہیں برابرستاتا رہا جس کا ذکرانہوں نے بار ہا کیا ہےاوراس کا درد ان کے اشعار میں بھی جھلکتا ہے۔صاحب کتاب نے ناظّم میواتی صاحب کے شعری وجدان کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہوئے ان کے شعری خصائص کواُجاگر کیاہے:

''ناظّم میواتی کے یہاں غزلیہ اشعار کی کثیر تعداد موجود ہے جوزندگی کےرنگارنگ تجربات کی بناپر ہمارے شعور کا حصہ بن جاتے ہیں۔ زمانے کی تلخیوں، زندگی کی محرومیوں، خویش و اقربا کی کج رویوں اور حالات کی مجبوریوں کوموصوف نے غزل کے سانچے غزل میں اس طرح سمودیا ہے کہ ہر حساس دل ان میں اپنے ہی دل کی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔'' (ناظّم میواتی،ص۱۱۹وص۱۲۰)

چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں ؎

محبت کے دو قطرے کبھی آنکھوں سے ٹپکے تھے
انھیں سے آج ہے شاداب شاخِ شاعری اپنی

میری کالی رات کی آنکھوں میں اک پانی کا چاند
چاندنی دینے کے پہلے ہی ڈھلک کر رہ گیا

زندگی کی آنکھ نے پالا تھا خوابِ نازنین
بے بسی کی گود میں لیکن سسک کر رہ گیا

جو دوشِ ناتواں پر تھا نہ جانے کون تھا میرا
اسی سے دشمنی تھی اور اسی سے دوستانہ تھا

ساحل پہ پہنچ کر تم کیوں بھول گئے مجھ کو
اس خون کے دریا میں میری بھی کہانی ہے

ناظّم میواتی سہسرامی نےنظم کے سانچے میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔پابند نظموں کے علاوہ نظم معریٰ اور آزاد نظموں کے ذریعہ بھی انہوں نے دل کے درد وداغ کے نقوش چھوڑے ہیں۔علاوہ اس کے زیر نظر کتاب میں ان کی نعتیہ شاعری کا بھی محاکمہ کیا گیا ہے۔ ناظّم میواتی کے دو نعتیہ اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں جس سے ان کی قادرالکلامی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق وعقیدت کا اظہار ہویدا ہے ؎

تم باعث تخلیق اور تخلیق کے مطلوب
تم مقصد تخلیق اور تخلیق کو مرغوب

تم حسن ہو اے پیکر حسن تخلیق
فنکار ازل کے ہو فقط تم محبوب

باب پنجم کے تحت مصنف نے ناظّم میواتی سہسرامی کی نثری نگارشات و تصانیف کا جائزہ لیا ہے۔ بڑوں کے لیے جہاں ''بے گٹھلی کا آم'' افسانوی مجموعہ ان کی یادگار ہے، وہیں ادب اطفال کے تحت ''تحفہ'' اور ''آزادی'' کہانیوں کے مجموعے ہیں۔''تحفہ'' دوسری زبانوں کی کہانیوں کا اردو ترجمہ ہے۔

یہ بات قبل بتائی جا چکی ہے کہ ناظّم میواتی سہسرامی ''مدرسہ خیر یہ نظامیہ'' اور ''مدرسہ خانقاہ کبیریہ'' سے دینیات میں سند یافتہ تھے، لہٰذا علوم قرآن وحدیث پر ان کا مطالعہ بڑا گہرا تھا اوراسی شغف کے پیش نظر انہوں نے ''جلب مضاعف القرآن''، لکھی جس میں قرآن کریم سے متعلق بیش بہا معلومات یکجا کی گئی ہیں۔اس کے علاوہ ''ہدایت مرشد'' حضرت قاضی محمد عنایت حسین چریا کوٹی کے فارسی ملفوظات کا اردو ترجمہ اور ''اسرارالعارفین وسیرالطالبین'' شیخ شہاب الدین سہروردی کا بامحاورہ سلیس اردو ترجمہ بھی ان سے یادگار ہے۔اس طرح ناظّم صاحب کی نثری خدمات کا دائرہ قرآنی علوم، تصوف کے نکات و رموز، ترجمہ، افسانہ نگاری اورادب اطفال تک پھیل جاتا ہے۔

کتاب کے آخری باب میں مصنف نے ناظّم میواتی کی شاعری اور نثر نگاری کے پس منظر میں ان کے مرتبے کی تعیین کرنا چاہا ہے اور اس تعلق سے کئی توجہ طلب پہلو کو اپنی سفارشات کا حصہ بنایا ہے۔

زیر نظر کتاب ''ناظّم میواتی سہسرامی: حیات اور کارنامے'' کے مصنف ڈاکٹر محمد صلاح الدین مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ناظّم صاحب کے علمی کارناموں کا تنقیدی جائزہ پیش کر کے اس خاموش خادم اُردو پر جسے ہم بھولنے لگے تھے، گفتگو کا باب وا کردیا ہے۔امید قوی ہے کہ ڈاکٹر محمد صلاح الدین کی یہ کتاب ناظّم شناسی کے حوالے سے اہل ذوق کے درمیان استناد کا درجہ پائے گی۔

❁❁❁

وفیات

آہ! علیم صبا نویدؔی

پٹنہ: گزشتہ دنوں سنیچر ۲۴ فروری ۲۰۲۴ء کی صبح معروف ناقد ومحقق، ادیب وشاعر اور چینئی کے بابائے اردو کہلانے والے علیم صبا نویدؔی اس جہان فانی سے رخصت ہوگئے۔ انا للہ الخ وہ بلغمی مزاج رکھتے تھے، ضیق النفس کے دائمی مریض تھے اور کافی دنوں سے ضعیفی کے مختلف عوارض میں مبتلا تھے، یہاں تک کہ اپنے وطن شہر چینئی میں ہی انہوں نے آخری سانس لی۔ ان کی نماز جنازہ، بعد مغرب مسجد امیر النسا، زعم بازار، چینئی میں ادا کی گئی اور امیر النسا بیگم قبرستان، رامارا ؤ گارڈن، چینئی میں ان کی تدفین عمل میں آئی۔

علیم صبا نویدؔی کا اصل نام علیم صبا تھا، لیکن وہ اپنے قلمی نام علیم صبا نویدؔی سے ہی جہان شعر وادب میں اپنی شہرت وشناخت رکھتے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۲۸ فروری ۱۹۳۷ء اور جائے ولادت چینئی تمل ناڈو کے ضلع شمالی آرکاٹ کا قصبہ امور (والا جاہ پیٹ) ہے۔ وہ دکن کے ایک معروف صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد کا نام سید غوث شاہ حسینی اور والدہ کا نام شرف النسا عرف سیدانی بی تھا۔ نبیرۂ امین الدین شاہ شطاری جناب علیم صبا کو قادری چشتی سنجری سلسلہ طریقت میں مولانا اسمٰعیل رفیعی خواجہ قدسی شاہ سے بیعت کا شرف حاصل تھا۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے بعد انہوں نے علی گڈھ مسلم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں امتیازی نمبروں کے ساتھ گریجویشن کیا اور پھر عملی زندگی میں اردو زبان وادب اور شاعری کی خدمت کے لئے اپنے بیشتر اوقات انہوں نے تاحیات وقف رکھا۔ وہ ایک کثیر التصانیف، نابغہ روزگار اور عالمی شہرت کے مالک ادیب وناقد اور شاعر تھے۔ انہوں نے نہ صرف مختلف اصناف نظم ونثر میں مسلسل طبع آزمائی کی، بلکہ اپنی ادبی وعلمی کاوشوں کی بدولت ریاست تمل ناڈو کو اردو کے حوالے سے نئی پہچان بھی دے گئے۔

بلاشبہ چینئی کے غیر اردو دادبی ماحول میں رہتے ہوئے انہوں نے اردو شعر وادب کی جو خدمتیں انجام دی ہیں، وہ ہر لحاظ سے مثالی کہلانے کی مستحق ہیں۔ اپنی انہیں خدمات کی بدولت وہ ''بابائے تمل ناڈو'' کہلاتے تھے۔ انہیں یہ خطاب بہار کے معمر وبزرگ ادیب وشاعر علامہ ناوکؔ حمزہ پوری نے ان کی کتاب ''تاریخ ادب اردو تمل ناڈو'' کی پیش کش پر دیا تھا جس کی پہلی جلد ایک ہزار چھ سو اور دوسری جلد ایک ہزار دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔

علیم صبا نویدؔی اردو کے جید عالموں میں تھے اور یہ کہنا غلط نہیں کہ ان کی وفات سے تمل ناڈو میں اردو زبان وادب کے ایک باب کا خاتمہ ہوگیا۔ علیم صباؔ نویدی نے نہ صرف بڑوں کے لئے کام کیا، بلکہ بچوں کو بھی ''صبا کے غنچے'' کے ساتھ ''ایوان علیم'' رائس منڈی چینئی کی شکل میں آموزش اردو کا ایک بہترین مرکز دے گئے۔ روزنامہ ''سالار'' بنگلور نے اپنی ۲۵ فروری ۲۰۲۴ء کی اشاعت میں ان کے انتقال کی خبر دیتے ہوئے بجا طور سے انہیں ''اردو زبان وادب کے آسمان پر گزشتہ کئی دہائیوں سے اپنی تابانیاں بکھیرنے والا ایسا روشن ستارہ'' قرار دیا ہے جو ''شہر چینئی کے ساحل پر ایک خشک صبح اپنی

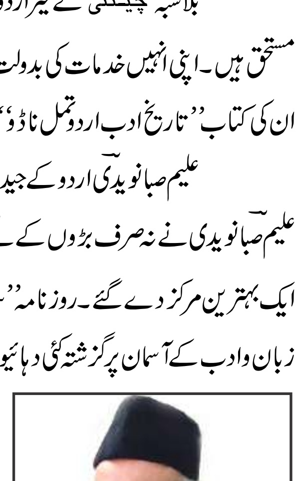

روشنی کی آخری رمق بکھیر کر قدرت کی آغوش میں سدا کے لئے پناہ گزیں ہوگیا۔'' علیم صبا نویدؔی نثر ونظم دونوں میں یکساں دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے نہ صرف جملہ انواع شاعری سے اپنا جذباتی اور وجدانی رشتہ استوار رکھا، بلکہ افسانہ نگاری اور ادب اطفال کے ذریعہ بھی زمانے کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا معترف بنایا۔ وہ یقیناً ایک کامیاب تنقید نگار، محقق اور تاریخ نویس تھے۔ ان کی کتابوں کی تعداد اَسی (۸۰) سے متجاوز ہے اور یہ کتابیں یقینی طور پر بحیثیت مجموعی ان کے گہرے مطالعے ومشاہدے اور ان کے ادبی وعلمی وژن ووقار کا پتہ دیتی ہیں۔ انہوں نے

شاعرانہ خودستائی کے طور پر اپنی مثنوی میں ''جدید نثر و نظم کے نئے بال و پر نکالنے'' کی بات کہی ہے تو یہ حقیقت سے بہت زیادہ دور نہیں اور یہ بھی کہ ''ملال و حزن کا نکھار'' ان کے یہاں نمایاں طور پر ''غزلوں کی بہار'' میں ڈھل گیا ہے۔

علیم صبا نویدؔی کی غزلوں کا پہلا مجموعہ ''طرح نو'' دوسرا مجموعہ ''نقش گیر'' اور تیسرا مجموعہ ''فکر بر'' کے نام سے اشاعت یافتہ ہے۔ اس کے علاوہ اُن کی ہائیکو نظموں کا مجموعہ ''تکمیلے''، ''سانیٹ کا مجموعہ'' اسم تاب ''نعتیہ سانیٹ کا مجموعہ''، ''نورالسمٰوات'' بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی اردو مثنوی ''اور راوی نے کہا'' بھی طبع شدہ ہے اور روزنامہ ''سالار'' بنگلور میں ان کی نثری غزلیں بھی چھپتی رہی ہیں۔ ''ردکفر'' ان کی آزاد غزلوں کا ''خاک زاد'' اُن کی نعتیہ شاعری کا ''لمس اوّل'' ان کی نظموں اور ''بھارت بانی'' ان کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے اور یہ سبھی کتابیں نہ صرف اشاعت یافتہ، بلکہ ان میں سے بعض دوبارہ اور سہ بارہ اشاعت یافتہ ہیں، اتنا ہی نہیں ''انوار مدینہ''، ''خوشبو کے داغ'' بھی ان کی مطبوعہ تصانیف میں شامل ہیں۔ ''شگاف در شگاف'' علیم صبا نویدؔی کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے اور یہ بھی پکی روشنائی میں دستیاب ہے۔

تحقیق و تنقید کے حوالے سے علیم صبا نویدی کی کتاب ''ٹمل ناڈو میں اردو''، ''ٹمل ناڈو کے مشاہیر ادب''، ''خواتین ٹمل ناڈو کی روشن تحریریں''، ''دکن کی دانش گاہوں میں اردو تحقیق و تنقید'' بھی ان کی نہایت اہم تصانیف شمار ہوتی ہیں۔ ان میں سے موخر الذکر دونوں کتابیں ان کی صاحبزادی ڈاکٹر جاویدہ حبیب نے ترتیب دیا ہے۔ اس کے علاوہ ''ٹمل ناڈو کا مفکر شاعر: دانش فرازی''، ''علیم صبا نویدؔی کے خطوط'' بچوں کے لئے علیم صبا نویدؔی کی نظموں کا مجموعہ ''صبا کے غنچے'' وغیرہ بھی موصوفہ ہی نے ترتیب دیئے ہیں۔ علیم صبا نویدؔی کی تصانیف میں ''اردو نظم کے سلسلے''، ''پاکستان میں اردو شاعری''، ''ٹمل ناڈو میں اردو رباعی''، ''کرناٹک میں جدید اردو نظم''، ''میری غزلیں'' بھی شامل ہیں اور اتنا ہی نہیں بلکہ ''اردو شاعری میں نئے تجربے''، ''مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر''، ''شعاع مشرق''، ''آزاد غزل''، ''اثر خامہ''، ''عرش غزل'' بھی جناب نویدؔی کے قابل ذکر تصنیفی تحائف کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض نصابی کتابوں میں بھی ان کے کلام کی شمولیت ہوئی ہے۔

علیم صبا نویدؔی ہمارے ان بلند مرتبہ اور بلند بحث فن کاروں میں محسوب ہوتے ہیں جن پر ان کی زندگی میں ہی سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد سے پی ایچ ڈی ہوئی۔ واضح رہے کہ ''علم صبا نویدؔی کی علمی ادبی خدمات'' کے زیرعنوان اُن پر ڈاکٹریٹ کا جو مقالہ لکھا گیا تھا اس کے نگراں کا نام ڈاکٹر محمد نورالدین اور مقالہ نگار کا نام محمد جعفر جری ہے۔ علاوہ ازیں اپنی گرانقدر علمی و ادبی خدمات کے لئے علیم صبا نویدؔی متعدد اعزازات سے بھی سرفراز ہوئے۔ انہیں ملنے والے ادبی اعزازات میں ''امتیاز میرؔ'' اور ''نوائے میر'' ایوارڈ میرؔ اکادمی لکھنؤ اور ''بسملؔ ایوارڈ'' بہار اردو اکادمی کے علاوہ ''جمیل شرقی'' و ''مولانا ناراجی صدیقی'' ایوارڈ ''ٹیپو ایوارڈ'' کڈپہ شریف اور خسروؔ، اقبالؔ، سرسید اور باقر آگاہ ایوارڈ وغیرہ شامل ہیں۔

یہ بات بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ علیم صبا نویدی اگرچہ چینئی کے تھے، مگر ان کا ادبی رشتہ شمالی ہند اور خصوصاً بہار سے بہت ہی مستحکم اور بہت ہی مخلصانہ رہا، یہاں تک کہ ان پر ''علیم شناسی'' (مرتبہ محمد توفیق خاں، ڈاکٹر انور مینائی)، ''بابائے اردو ٹمل ناڈو'' (مرتبہ فاروق جائسی)، ''مطالعہ علیم صبا نویدؔی''، ''علیم صبا نویدؔی: شخص و عکس'' (مرتبہ مختار بدری) نامی جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں ''علیم صبا نویدؔی: بہار کے دانشوروں کے درمیان'' نامی

کتاب بھی شامل ہے جسے علی منیر نے ترتیب دیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ علیم صبا نویدؔی سے بہار کا ادبی حلقہ بڑی محبت رکھتا تھا اور جناب نویدؔی بھی بہار کے ارباب قلم اور یہاں کی ادبی صحافت کو بہت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے۔ اس باہمی علمی محبت اور ادبی قدردانی کا اندازہ یوں ہوتا ہے کہ جناب نویدؔی کو ''بابائے تمل ناڈو'' کا خطاب یہیں دیا گیا۔ ان کی متعدد تصانیف مثلاً ''خاک زاد''، ''فکر بر'' اور مثنوی ''راوی نے کہا'' پر یہاں کے اکابرین ادب کے تاثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ اوّل الذکر کتاب کے بارے میں ناوکؔ حمزہ پوری اور پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ نے اپنی قیمتی اور پسندیدہ رائے دی ہے تو ''فکر بر'' کے حوالے سے ڈاکٹر قمر اعظم ہاشمی نے لکھا ہے کہ:

''علیم صبا نویدؔی کی تخلیقی بصیرت اور عصری حسیت شعر وشاعری کے جدید میلان کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے۔''

مظہر امام ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ:

''ان کی غزلوں کا احساس اور طرز احساس نئی حسیت سے ہم آہنگ ہے۔''

پروفیسر علیم اللہ حالؔی نے جہاں علیم صبا نویدؔی کی شاعری میں لہجہ کے وقار اور موضوع کی سنجیدگی کو اس کی نمایاں خصوصیات بتایا ہے، وہیں ان کی مثنوی ''اور راوی نے کہا'' کی بابت لکھا ہے کہ:

''یہ اردو مثنوی ایک نادر تخلیق ہے اور ان کی عام شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کی فنکارانہ ہنرمندی کا روشن اشاریہ۔''

اس میں شک نہیں کہ علیم صبا نویدؔی نہ صرف قادر الکلام شاعر تھے بلکہ ادبی تنقید وتحقیق کی دنیا میں بھی بڑا مرتبہ رکھتے تھے اور خصوصاً تحقیق کو ادب وزندگی دونوں کے لئے راہ بر مانتے تھے۔ اس حوالہ سے ان کے ایک بیان کا یہ اقتباس نہایت اہم ہے جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ:

''انگریزی میں ریسرچ کے معنی ہیں کسی نئی چیز کی تلاش یا حقیقت اور سچائی کی کھوج لگانا۔ اردو میں اس عمل کو تحقیق کہا جاتا ہے جو حق سے مشتق ہے اور بے حد معنی خیز ہی نہیں بلکہ بڑی وسعتوں کا حامل ہے۔ تحقیق دراصل ایک نفسیاتی قوت اور صلاحیت کا نام ہے جو چند ہی انسانوں کو نصیب ہوتی ہے۔ تحقیق، ادب اور زندگی دونوں کی راہ بر ہوتی ہے۔ تحقیق جب ادب میں سچائی کی منزل کو چھوتی ہے تو اس کا اثر زندگی پر بھی عکس ریز ہوتا ہے۔'' (دکن کی دانشگاہوں میں اردو تحقیق اور تنقید، ص ۲)

جیسا کہ قبل بھی ذکر ہو چکا، علیم صبا نویدؔی بہار اردو اکادمی سے خاص ادبی تعلق خاطر رکھتے تھے۔ اکادمی کے زیر اہتمام دوروزہ عالمی اردو کانفرنس منعقدہ ۱۲-۱۳ فروری ۲۰۱۶ء میں شرکت کے لئے اکادمی میں ان کی تشریف آوری ہوئی تھی اور اس موقع پر منعقدہ مشاعرے میں انہوں نے اپنے اس شعر سے بھی نوازا تھا ؎

تبسم کے جتن کرنا پڑے گا　　　غموں کو بے وطن کرنا پڑے گا

علیم صبا نویدؔی اکادمی کے مجلّہ ''زبان وادب'' کے قدیم قلمی محسنین میں تھے۔ سال گزشتہ نومبر ۲۰۲۳ء کے شمارے میں بھی ''مناظر عاشق ہرگانوی کی نعت گوئی'' کے عنوان سے ان کے ایک مقالہ کی شمولیت ہوئی تھی۔ زیر نظر شمارے میں بھی ان کی ایک حمد ''تری شان جل جلالہٗ'' تیمناً و تبرکاً شامل اشاعت ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ خدائے پاک ان کی ادبی خدمات کو ان کے لئے مغفرت کا سامان بنادے اور اردو زبان وادب کو ان کے نعم البدل سے نوازے۔ ❀❀

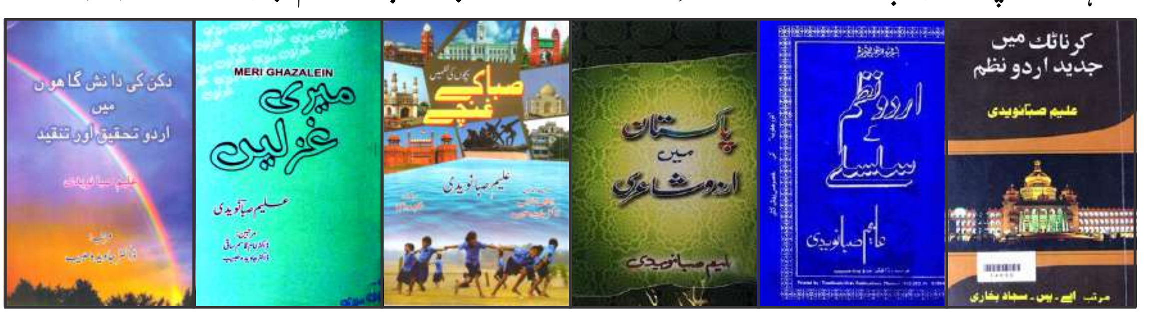

☆ مارچ ۲۰۲۴ء کا ''زبان وادب'' موصول ہوا۔ اس شمارے کا سرورق اور پس ورق ''ذکر ساحؔر'' کی مناسبت سے ہے اور بہت ہی خوب اور خوبصورت ہے، پھر دونوں اندرونی سرورق بھی حسب روایت بہت معلوماتی ہیں۔ وہ مارچ ہی کا مہینہ تھا جب ساحؔر لدھیانوی اس دنیا میں آئے تھے، اس مناسبت سے آپ نے اس عظیم اور مشہور شاعر کے ادبی ذکر کا اہتمام کیا ہے، اس کے لئے آپ شکریہ کے مستحق ہیں اور پھر اپنے اداریہ ''حرف آغاز'' میں آپ نے اس خصوصی حصے کے بارے میں یا یوں کہوں کہ ''ذکر ساحؔر'' کے مشمولات پر آپ نے جس انداز سے اور جتنے اختصار، مگر جتنی جامعیت کے ساتھ چند سطریں لکھ دی ہیں، اُنہیں اس کا ایک کامیاب خلاصہ کہنے میں شاید کوئی مضائقہ نہیں۔ ترقی پسندوں کو یوں بھی غزل کی مخالفت ہی زیادہ راس آتی رہی اور اس کا اثر بہرحال ظاہر بھی ہوا۔ ساحؔر نے غزلیں کہی ہیں، مگر حق یہی ہے کہ اس کی پہچان نظموں اور گیتوں سے ہی بنتی ہے۔ یہ تو ایک بڑا سوال اپنی جگہ ہے کہ ساحؔر کی شہرت میں زیادہ حصہ اس کی اشتراکی شاعری کا ہے یا اس کی فلمی شاعری کا، اس تعلق سے میرا خیال ہے کہ ترقی پسند شاعروں میں فلموں سے وابستگی کی بدولت ہی ساحؔر کے لئے شہرت اور مقبولیت کے وہ دروازے کھلے جو آج بھی کھلے ہوئے ہیں، پھر رومان سے حقیقت کی طرف آنے کا معاملہ بھی ہے، جہاں تک میری سمجھ کہتی ہے، دوسرے ترقی پسند شاعروں کے مقابلے میں ساحؔر کی یہ خصوصیت نظرانداز نہیں ہوسکتی کہ حقیقت کی طرف آنے کے باوجود اس نے عشق و رومان سے ہمہ صورت اپنا واضح رشتہ بنائے رکھا۔ فیضؔ اور دوسرے شاعروں کی طرح ''دوعشق'' کا معاملہ اس کے یہاں بھی ہے، مگر اس نے ایک عشق کے لئے دوسرے عشق کو غیر فطری انداز سے کبھی تیاگ نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انسانی قدروں کا نقش گر بھی رہا اور ''وادی عشق کا شاعر'' بھی۔ ڈاکٹر صابر علی سیوانی اور جناب فخرالدین عارفی نے اپنے موضوع سے یقیناً انصاف کیا ہے، رہی بات اشعار کے استعمال کی تو وہ شاید جتنا غلبہ پا گئے ہیں، اس سے کم غلبہ بھی پا سکتے تھے۔ اس حصے کے دیگر مضامین بھی کامیاب ہیں۔ صادق علی انصاری، آفتاب احمد اور ڈاکٹر فائزہ احمد نے ساحؔر کے نغموں اور ساحؔر کی نظموں پر مناسب و مفید انداز سے لکھا ہے۔ نتن پربھاکر مہاجن نے ساحؔر پر اپنی نظم کے ایک بند میں ساحؔر کے مصرعوں کو لے کر جس طرح اُسے خراج عقیدت پیش کیا ہے، وہ بہت ہی موثر ہے۔ ''مقالات'' کی خاص سوغات سید محمد نیر رضوی کا مضمون ہے۔ اسے میں نے بڑی دلچسپی اور بہت غور سے پڑھا، اس لئے بھی کہ خواجہ حسن نظامی پر کم ہی پڑھنے کو ملتا ہے اور اس لئے بھی کہ خانقاہ مجیبیہ سے ان کے تعلق کے بارے میں تو شاید اور بھی بہت کم لکھا گیا ہے۔ میرے مطالعہ میں تو یہ موضوع پہلی بار ہی آیا ہے۔ حلیم صابر کی کاوش نے ''شمسؔ کرائے پرسرانیوی'' سے ملاقات کا موقع دیا، یہ بھی کم سے کم میرے لئے پہلی ملاقات ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ تقسیم اور پھر ہجرت کے المیہ نے بہار کے بہت سارے فن کاروں کو گوشہ گمنامی میں چلے جانے پر مجبور کردیا، اب ان کے بارے میں جہاں جو باتیں پڑھنے کو مل جائیں بس علمی و ادبی تبرک ہی کہلائیں گی۔ عبیدالرحمٰن نے اختر الایمان کی مشہور نظم ''ایک لڑکا'' کا تجزیہ بہت اچھے ڈھنگ سے کیا ہے۔ واقعی اردو نظم کے ذخیرے میں یہ نظم اپنی خاص معنویت رکھتی ہے۔ منور رانا کی شاعری پر محمد معتصم باللہ کا مضمون بھی مختصر، مگر کامیاب ہے۔ ''افسانے'' کے حصہ میں مسرور تمنا کی کہانی ''آج پھر جینے کی تمنا ہے'' میں آواز کے جادو کی بات اپنی جگہ، مگر مجھے یہ کہانی بس فلمی انداز کی کہانی لگی اور رہی بات محمد طارق کے افسانہ ''ببول کا سایہ'' کی تو اس کے بارے میں آپ نے ''حرف آغاز'' میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے عدم اتفاق کی کوئی وجہ نہیں۔ انشائیہ ''قطار'' بھی خاصا دلچسپ ہے اور لطف یہ کہ درپردہ اس میں اصلاح حال کا انتباہی پیام بھی ہے اور اس کا رشتہ عصری منظرنامہ سے

بھی ٹوٹا نہیں ہے۔''منظومات'' کے حصے بھی خوب شاد و آباد محسوس ہوئے اور''کتابوں کی دنیا'' میں تبصرے بھی بڑے جاندار، پُرمغز اور متوازن ہیں۔ بچوں کے حصے میں ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' والی کہاوت کا ماضی اور حال ڈاکٹر قیصر زاہدی نے مزے دار اور معلومات بھرے انداز سے اجاگر کر دیا ہے۔ اسی طرح عائشہ رفعت کی ''ایک دوا کی کہانی اس کی زبانی'' بھی بچوں کے لئے معلوماتی اور مفید ہے اور دلچسپ پیامی انداز سے لکھی گئی ہے۔ ادیبہ حیات شفا کا مضمون ''موبائیل کا استعمال'' خاص طور سے بچوں کو ہوشیار کرنے پر دھیان دلائے گا۔ مجموعی طور سے اس کامیاب شمارے کے لئے آپ کو اور آپ کی پوری ٹیم کو مبارکباد دیتے ہوئے خدا حافظ!

(ڈاکٹر) نشاط اختر، ویشالی

☆ ''زبان وادب''، مارچ ۲۰۲۴ء ملا۔ بچوں کا حصہ آپ نے خوب خوب سجایا اور سنوارا ہے۔ روزے کا مبارک مہینہ سایہ فگن ہے اور اس نسبت سے اس حصہ کی دونوں نظمیں بہت ہی پسند آئیں۔ عبدالرزاق دلؔ کھولا پوری کی نظم قیمتی نصیحتوں سے آراستہ ہے جو رمضان اور روزے کے آداب و احترام پر دھیان دلا رہی ہے۔ اسی طرح ''پہلا روزہ'' کے عنوان سے صباؔ نقوی کی نظم بھی بہت اچھی لگی اور اسے پڑھ کر اپنا بچپن اور وہ دن یاد آ گیا جب میں نے اپنی زندگی کا پہلا روزہ رکھا تھا۔ عید کی اصل خوشی روزہ داروں کے لئے ہے اور روزہ بس اللہ کی خوشنودی کے لئے ہی رکھا جاتا ہے۔ اپنے بڑوں کے یہ جملے آج بھی کانوں میں گونج رہے ہیں اور یہی بات شاعر نے بھی یاد رکھنے کو کہا ہے کہ روزہ میں ''دل کی طلب ہو خلد کا میوہ'' اس بار ڈاکٹر قیصر زاہدی نے ایک طرف ''بوڑھی گھوڑی لال لگام'' کے عنوان سے ذرا سا مزاحیہ رنگ لاتے ہوئے کہاوت اور خاص طور پر عنوانیہ کہاوت کے پیچھے چھپے واقعہ کو بہت خوبصورتی سے ہمارے مطالعہ میں لا دیا ہے۔ یقیناً اسے ایک دلچسپ مضمون کہلانے کا حق ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ معلوماتی بھی ہے۔ عائشہ رفعت نے ''ایک دوا کی کہانی: اس کی زبانی'' بھی بڑے مزیدار انداز سے تحریر میں لایا ہے۔ یہ ''پینسلین'' کی ایجاد کی کہانی ہے اور آخر میں اس کا پیغام بھی ڈھکا چھپا نہیں رہتا اور اس کے پیچھے چھپا فلسفہ بھی مل جاتا ہے کہ ''آدمی کو اچھی سوچ رکھنی چاہئے اور اپنی صلاحیت، محنت اور معلومات سے پوری طرح کام لینا چاہئے'' بیشک ''انسانی ہمدردی، خاص طور سے بیماروں کی راحت اور صحت کا خیال بڑی چیز ہے اور یہ بھی کہ پیہم جستجو ہی انسانی زندگی کا راز ہے۔'' فاطمہ خان کی چھوٹی اور سادہ سی کہانی ''ابو سے محبت'' بھی اچھی لگی اور محمد علی رضا کی سوغات سے دل بہت خوش ہوا، ان کا بار بار شکریہ کہ انہوں نے امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے اقوال یکجا کر دیے ہیں۔ یہ اقوال کیا ہیں، انہیں تو وہ دائمی نسخہ کہنا چاہئے جس کے استعمال سے ہر حال میں زندگی کے سنورنے کی ضمانت ملتی ہے۔ اس شمارے کا آخری مضمون ''موبائیل کا استعمال'' جسے ادیبہ حیات شفا نے لکھا ہے، خاص طور سے اپنی ضرورت اور اہمیت کا احساس دلاتا ہے۔ یہ موبائیل فون ایک ایجاد ہے اور جس طرح کسی بھی ایجاد کے شوقیہ استعمال سے نقصان ہوتا ہے اسی طرح موبائیل کے صرف شوقیہ استعمال کی عادت میں بھی نقصان ہی نقصان ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ موبائیل میں خوبی ہی خوبی ہے، بس خرابی آتی ہے تو استعمال کرنے والے کے طریقہ اور مزاج اور بے احتیاطی کے رویے سے جس پر دھیان دینے میں ہی بھلا ہے۔

محمد سعد اختر، مظفرپور

☆ ''زبان وادب''، فروری ۲۰۲۴ء پیش نظر ہے۔ سرورق پر ''نجم الدولہ دبیرالملک مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کا توقیع نامہ بنام علاءالدین خاں ''فن اُردو میں نـظماً و نثراً تم میرے جانشین ہو'' ان کے لئے بڑے اعزاز کی بات ہے اور اس کا عکس شمارے کی شان میں اضافہ کا باعث، جب کہ پس ورق پر یوم جمہوریہ کے موقع پر پرچم کشائی کا حسین و جمیل منظر ہے۔ اندرونی سرورق پر شائقؔ عظیم آبادی کی تصویر اُن کی غزل اور اُن کے حالات درج ہیں جب کہ آخری اندرون سرورق پر شمسؔ منیری کی نعت بعنوان ''ارض حجاز'' مع ان کی تصویر درج ہے اور ان کے کوائف بھی دیئے گئے ہیں۔ ''حرف آغاز'' میں مندرجات کا مختصر بیان درج ہے، جب کہ ''ذکر غالبؔ'' کے ذیل میں غالبؔ پر چار مضامین درج ہیں۔ پہلا مضمون ڈاکٹر علی عباس امیدؔ کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے

''غالبؔ کا عشق واقعی'' یہ تحقیقی مقالہ بارہ حواشی کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے اور تاثر اس سے یہ بھی ملتا ہے کہ غالبؔ کو ۱۲ کے عدد سے قلبی لگاؤ تھا۔ دراصل یہ مضمون تمام تر اس بات پر مصر ہے کہ غالبؔ کو حضرت علی سے والہانہ عشق تھا۔ ہوا کرے اس میں برائی کیا ہے، مگر زیادتی یہ ہے کہ وہ اس جذبہ میں اس درجہ مستغرق ہو گئے تھے کہ حالیؔ کو بھی یہ کہنا پڑا کہ ان کا رجحان اہل تشیع کی جانب تھا بلکہ دہلی کے اکثر لوگوں کو یہ گمان تھا کہ ان کا عقیدہ ''نصیری'' ہے۔ یہ اہل تشیع کا وہ فرقہ ہے جو علی کو خدا مانتا ہے۔ معاذ اللہ۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ان کی تدفین سنی گورستان میں عمل میں آئی۔ اس کے شواہد کو تسلیم کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہونا چاہئے۔ دوسرا مضمون محترمہ شبانہ عشرت صاحبہ کا ہے۔ انھوں نے ''بخت غالبؔ'' پر خامہ آرائی کی ہے۔ اس کی ابتدا ایک فلسفیانہ عبارت سے ہوئی ہے اور پھر غالبؔ کی زندگی کے اتار چڑھاؤ پر تان ٹوٹی ہے، بہر حال یہ ایک اچھا مضمون ہے۔ جناب نجم الزماں نے ''غالبؔ کی صوفیانہ شاعری پر ایک نظر'' ڈالی ہے۔ ان کے مطابق غالبؔ کی صوفیانہ شاعری دراصل ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ شاعری کا ایک حصہ ہے، لیکن اس میں تصوف کے عقائد کو سہارنے کے لیے کوئی شدید جذبہ موجود نہیں۔ محترمہ ثنا ثمرین کے مضمون ''غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور'' کا لب لباب یہ ہے کہ غالبؔ نے میرؔ و مومنؔ کے انداز میں اپنے کلام کو عام فہم بنایا۔ دوسرے یہ کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے دیوان غالبؔ کو مقدس وید کی طرح الہامی کتاب قرار دیا، بہر حال خیال اپنا اپنا۔ ''مقالات'' کے ذیل میں ''۲۰۲۳ء کے افسانوی اور افسانچوں کے مجموعے'' از پروفیسر اسلم جمشید پوری اور ''اُردو شاعری میں ہندوستانی تہذیب کا رنگ'' از محترمہ نہاں قابل توجہ ہیں۔ ''املا نامہ'' میں ''اُردو املا کیسے لکھیں'' ڈاکٹر اسلم جاوداں کا لکھا ہوا ہے جو اساتذہ اور طلبہ کے لیے بہت ہی مفید مضمون ہے۔ افسانوں میں ''زہر میں بجھا ہوا تیر'' از شاکر کریمی پہلا افسانہ ہے۔ دوسرا افسانہ ''افتخار عظیم چاند کا لکھا ہوا ہے۔ عنوان ہے ''......اوران کا ساتھ چھوٹ گیا'' دونوں افسانوں میں ساتھ چھوٹ جانے کی بات مشترک ہے۔ یہ دونوں اچھے افسانے ہیں۔ ''منظومات'' کے تحت دو نعت پاک شامل اشاعت ہیں اور متاثر کرتی ہیں۔ پھر دو ''نظمیں'' ہیں۔ غزلوں میں تابشؔ رودولوی اور عامرؔ عطا کا کلام نہایت متاثر کن ہے۔ ''بچوں کا زبان و ادب'' میں چار سبق آموز مضامین اور دو بہت خوب نظمیں شامل ہیں۔ بچے ان سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

مصطفیٰ ندیم خان غوری، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

☆ مجلّہ ''زبان و ادب'' جنوری ۲۰۲۴ء باصرہ نواز ہوا۔ گزشتہ چند ماہ سے شمارے کے سرورق اور پس ورق کے علاوہ اندرونی سرورق پر معتبر اہل قلم حضرات کی تصاویر اور ان کی تحریروں کے عکس شائع کرنے کا جو سلسلہ قائم کیا گیا ہے وہ قابل قبول بھی ہے اور قابل داد بھی۔ از راہِ کرم اسے آئندہ بھی جاری رکھیں۔ ماہ جنوری کے شمارے کے سرورق پر شادؔ عظیم آبادی کی دلکش تصویر اور ان کی تحریر کا عکس پیش کرنا گویا ان کو بہترین خراج عقیدت ہے۔ اندرونی سرورق پر مشہور شاعر ولیؔ کاکوی کی تصویر مع مختصر تعارف دی گئی ہے اور ان کی وہ مشہور غزل پیش کی گئی ہے جس کا ایک ایک شعر زبان زد خاص و عام ہے۔ ٹھیک اسی طرح بہار کے نامور شاعر مانوسؔ سہرامی کے مختصر، مگر جامع تعارف اور ان کی غزل نے شمارے کے معیار کو دوبالا کر رہا ہے۔ مجموعی طور پر یہ شمارہ ایک دستاویزی حیثیت کا حامل ہے۔ جس چابک دستی سے اداریہ کے تحت چند الفاظ میں اس شمارے کے مشمولات کا تجزیہ قلم بند ہوا ہے، وہ آپ کے اعلیٰ ادبی ذوق وصلاحیت کو اجاگر کرتا ہے۔ ذکر شادؔ کے تحت محمد شوکت جمال کا مقالہ ''شادؔ عظیم آبادی گلستان ہزار رنگ میں'' طویل، مگر نہایت دلچسپ، معلوماتی اور پُر مغز ہے۔ گل آفرین نے اپنے مقالہ ''شادؔ عظیم آبادی اپنی رباعیوں کے درپن میں'' نہ صرف شادؔ عظیم آبادی کی کئی رباعیات سے مدلل بحث کی ہے بلکہ اردو میں رباعی گوئی کی تاریخ پر بھی ایک سرسری نظر ڈالنے کی ہمہ جہت سعی کی ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ وہ اس مضمون کے عنوان میں ''درپن'' کی جگہ لفظ ''آئینہ'' اور لفظ ''رباعیوں'' کی جگہ لفظ ''رباعیات'' استعمال کرتیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے مضمون ''غلام سرور کی ادبی خدمات'' میں نہ صرف غلام سرور کی ادبی، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے بلکہ ان کی زندگی سے وابستہ چند کم

معروف، مگر اہم واقعات سے بھی قارئین کو روشناس کرانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ نازنین فاطمہ نے اپنے تحقیقی مقالہ ''بہار کے لوک گیت: چند نکات'' میں لوک گیتوں کے مختلف اقسام مثلاً جوگ، ٹونا، شہانہ گیت، برہا اور جھومر وغیرہ سے متعلق بحث کی ہے اور دلچسپ نمونے بھی پیش کئے ہیں، اس طرح ان کا یہ مضمون خاص طور سے قاری کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھتا ہے۔ ان کا یہ قول حقیقت پہ مبنی ہے کہ ''...... مجھے کہنے دیجئے کہ زندگی صرف پڑھے لکھے افراد سے ہی نسبت نہیں رکھتی بلکہ زندگی ان کی بھی ہوتی ہے جو ناخواندہ ہیں اور ایک ادیب وشاعر صرف خواندہ افراد کی زندگی ہی کا ترجمان نہیں ہوتا، بلکہ ایسے افراد کی بھی ترجمانی کرتا ہے جو قلم کاغذ سے واسطہ نہیں رکھتے اور جن کا تلفظ بھی صحیح نہیں ہوتا۔'' محمد سلیم کے افسانہ ''فطرت کا تقاضا'' کو علامتی افسانے کے زمرے میں رکھنا غلط نہیں، اس مختصر سے افسانے میں انہوں نے اشاروں ہی اشاروں میں معاشرے کو پراگندہ کرنے والے کئی چہروں کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو قابل ستائش ہے۔ آصف احمد کی نعت پاک عمدہ اور بے حد روح پرور ہے۔ شاہد اختر کی غزل کا یہ مطلع ؎

بیان ہونے سے قصہ ہی رہ گیا اپنا
زبان جم سی گئی لب نہیں کھلا اپنا

دل کو چھو گیا۔ دیگر شعرا کا کلام بھی لائق تحسین وستائش ہے۔ حسب روایت ''کتابوں کی دنیا'' بھی قابل مطالعہ ہے۔ ڈاکٹر تبسم فرحانہ کے شعری مجموعہ ''افکار تاباں'' پہ منیر سیفی کا تبصرہ بہت ہی معقول، متصفانہ اور متوازن ہے۔ یہاں مجموعے کے تقریباً سبھی پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے، ساتھ ہی مبصر نے شاعرہ کا مختصراً تعارف بھی پیش کر دیا ہے۔ اس طرح انہوں نے تبصرے کا ایمانداری سے حق ادا کر دیا ہے۔ ''بچوں کا زبان وادب'' میں شامل سبھی قلمکاروں کی تخلیقات نہایت ہی دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔ ڈاکٹر بانو سرتاج کی کہانی ''شرافت کا لباس'' مختصر ہے، مگر دعوت غور وفکر ضرور دے رہی ہے۔ رخشاں ہاشمی کی نظم ''سردی کا موسم'' بھی دلچسپ ہے۔ بینش فردوس کا مضمون ''آواز کے لچھن'' آواز کے تعلق سے طلبا کے لئے کارآمد مواد فراہم کرتا ہے، مگر مضمون کا عنوان توجہ طلب ہے۔ اس مضمون کا عنوان کچھ اور خوبصورت عمدہ ودلچسپ ہوسکتا تھا۔

(ڈاکٹر) قیصر زاہدی، پٹنہ

بوڑھا آدمی اور بوڑھا کتا (ص ۴۴ سے آگے)

کتے کے مرنے کی خبر پوری گلی میں پھیل گئی۔ لوگ آتے، تمباکو، بیڑی، سگریٹ لیتے اور کتے کی موت کے بارے میں پوچھتے۔

بوڑھا سر جھکائے چپ چاپ سامان دے دیتا۔ جب لوگ کتے کو اٹھا کر دفنانے لے جانے لگے تو بوڑھے نے منہ پھیر لیا۔

لوگوں میں کھسر پھسر ہونے لگی: ''بوڑھے کو کتے سے بے انتہا محبت تھی۔ اس کی موت کے بعد سے اسے کیسی چپ لگ گئی ہے۔''

رات میں کھانا لے کر جب بڑھیا آئی تو دکان سمیٹتے ہوئے بڑبڑانے لگی: ''قاتل کو ذرا بھی رحم نہیں آیا۔ ایک کتے کو بھی چین سے کھاتے نہیں دیکھ سکتے...... اور خود کو انسان کہیں گے۔''

بوڑھا خاموشی سے کھاتا رہا۔ ❁❁

خصوصی توجہ طلب

اکادمی مجلّہ ماہنامہ ''زبان وادب'' کے بارے میں ساری معلومات کے لئے انچارج جناب محمد شاہد سے ان کے موبائیل 9897958115 پر نیز مسودات اور کتابوں پر انعامات کے سلسلے میں انچارج جناب محمد تمنا سے ان کے موبائیل 9931606459 پر رابطہ کریں۔ شکریہ! (ادارہ)

خریداروں کے لئے ضروری اطلاع

☆ محکمہ ڈاک نے انڈر پوسٹنگ سر ٹیفکیٹ سسٹم ختم کر دیا ہے، لہٰذا خریدار حضرات کو اب سادہ ڈاک سے رسالہ بھیجا جاتا ہے۔ رسالہ کی گمشدگی کے لئے ادارہ پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری اور باز پرس نہیں ہوگی۔

☆ اس دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔ (سرکولیشن انچارج)

بچوں کا

زبان و ادب

☆	راہ رَو	عظیم اقبال	۷۴
☆	زیرو یا ہیرو	جہانگیر اُنس	۷۵
☆	بچوں کی بیت بازی	آزادؔ سونی پتی	۷۶
☆	چوں چوں عید مبارک	محمد سراج عظیم	۷۷
☆	اُستاد	محسن باعشن حسرتؔ	۷۹
☆	صلہ رحمی	علی عامر	۸۰
☆	نصیحت	مختار احمد عاصیؔ	۸۰

عظیم اقبال
"Adabistan" Ganj - 1, Bettiah - 845439 (Mob. 9006502649)

راہ رَو

ایسا نہیں تھا کہ کسی اُکتاہٹ نے اُسے گرفت میں لے لیا ہو، اُس پر مردنی چھانے لگی ہو یا تازہ دم ہونے کے لئے بے چین ہو۔ بس ایک تجسس تھا، جس کے تحت کسی دَم وہ تھم جاتا اور اگر کوئی نظر آجاتا تو خیر سگالی کے ناطے سلام ودعا کے تبادلے ہوجاتے۔ ہونٹوں کی قید سے چھوٹ کر مسکراہٹیں آپس میں گلے مل لیتیں۔ مسافت سے متعلق اتنا ضرور پوچھ لیتا کہ اگلے شہر تک رسائی میں اُس کتنا وقت لگے گا۔ بیتے ہوئے فاصلے کا اُسے بخوبی اندازہ تھا، لیکن آنے والے فاصلے سے قطعی بے خبر تھا۔ اُس کی بے خبری اس کی تحریک کی وجہ تھی۔ کبھی دور تک اپنے قدم گنتا، پھر یہ گنتی رُک جاتی۔ کبھی گردوپیش پر نظر ڈالتا، راستے کے کنارے، کنارے لگے درختوں کی پہچان بھی کرتا۔ تاہم ایسا کسی دم نہیں ہوا کہ سفر کو التوا میں ڈال دینے کا خیال آجائے۔

پو پھٹتے ہی وہ چل پڑا تھا۔ تیاری پوری، پوری تھی، بس چوکھٹ سے باہر نکلنا تھا۔ باہر نکلتے ہوئے وہ کسی پس وپیش سے دوچار نہ ہوا۔ یہ سوچنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ کدھر اور کہاں جانا ہے۔ اب تک کھیت، کھلیان، نیم تاریکی میں لپٹے ہوئے تھے۔ صرف شبیہ کا اندازہ ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود انسان سے لے کر چرند وپرند تک کاروبار میں لگ گئے تھے۔ چڑیاں پھدک رہی تھیں ''چوں، چاں'' کر رہی تھیں اور کوے اپنی مخصوص بولی نکال رہے تھے، فضا میں اوپر، نیچے جا رہے تھے، چکر کاٹ رہے تھے، تاک میں لگے تھے کہ کھانے کے لئے کچھ نظر آجائے، کچھ دکھائی دے تو لپک جائیں۔ رُک رُک کر مرغ کی بانگ بھی آنے لگی تھی: ''ککڑوں کوں!'' پگڈنڈیاں آباد ہونے لگی تھیں۔ کوئی آگے تھا، کوئی پیچھے اور سڑک پر آمدورفت شروع ہوگئی تھی۔ مال بردار گاڑیاں ''پوں، پوں'' کرتی دندناتی پھر رہی تھیں۔ چند لوگ سروں پر بھی بوجھ اٹھائے تھے۔ اُس کے سر پر بھی ایک بڑا گٹھر اور ہاتھ میں ایک لاٹھی تھی۔ اگرچہ اُسے سہارے کی ضرورت نہ تھی، وہ اُسے تھامے ہوئے تھا۔ راستہ نیا تھا، لیکن اس کے متعلق اس نے پوچھ تاچھ کرلی تھی۔ ناک کی سیدھ میں چلتے جانا تھا، کوئی موڑ آتا بھی تو بس نام کے لئے۔ موڑ پر وہ تھمتا، نہ رُکتا۔

اگلا شہر اس کا آخری پڑاؤ نہیں تھا، اُسے آگے بھی جانا تھا، تھوڑا آگے۔ ویسے سفر کی طوالت اُسے پریشان کر رہی تھی، نہ کسی صعوبت نے دِق کر رکھا تھا۔ بھوک اور پیاس کا غلبہ بھی نہ تھا۔ بتایا گیا تھا کہ دن کے ڈھلان سے پہلے ہی وہ اپنی منزل تک پہنچ جائے گا۔ اسے لے کر بھی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ ہر فکر سے آزاد تھا۔ دن کا سفر بخوبی جاری تھا۔

قسم قسم کی گاڑیوں پر سامان لادے اور لٹکائے لوگوں کے رواں، دواں ہونے سے بازار کے قریب ہونے کا عندیہ مل رہا تھا۔ جلد پہنچیں گے تو سودا بھی جلد پٹ جائے گا۔ دیر ہوگی تو گاہک ہاتھ سے نکل جائیں گے۔ آگے بڑھا تو کھیت میں ایک کاشت کار پر نگاہ پڑی۔ گھٹنوں پر جھکا ہوا کام میں لگا تھا۔ اس نے آواز لگائی:

''بھیا! او بھیا! اگلے شہر تک پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

مگر کاشتکار نے کچھ نہ کہا۔ بس چپ رہا۔ اُس نے چند ساعتیں، کھڑے، کھڑے گزار دیں، پھر قدم اٹھائے۔ ابھی وہ تقریباً سو گز چلا تھا کہ کاشت کار چلا اٹھا: ''قریب، قریب بیس منٹ!''

اُس نے جواباً کہا: ''شکریہ!'' پھر دریافت کیا: ''جب پوچھا تھا، تبھی کیوں نہ بولے؟'' وہ حیرت میں پڑا تھا۔ آخر ماجرا کیا تھا؟ سوال ایسا مشکل بھی نہ تھا کہ جواب سوچنے یا تلاش کرنے میں اُسے اس قدر وقت لگ جائے۔ کاشت کار کا جواب تھا۔

''پتہ نہ تھا کہ آپ کس رفتار سے چلتے ہیں۔'' کہتے کہتے کاشتکار مسکرا دیا۔ وہ بھی ہنسا۔ ''خوب! بہت خوب!'' رُکے ہوئے اُس کے قدم پھر اُٹھ گئے، اُسی طرف جدھر اس کی منزل تھی۔

جہانگیر اُنس

Ranipur ,Barharia, Siwan-841232 (Bihar) (Mob.9162357830)

زیرو یا ہیرو

مملکت علم الاعداد کے نو رتنوں کی محفل سجی ہے۔ میر محفل سالار کارواں حضرت ''نو'' ہیں جو پہلی صف میں سنہری شاہی کرسی پر رونق افروز ہیں۔ ان کی حیثیت سب سے اعلیٰ ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند ہوتا ہے۔ موصوف سے سبھی رتن خوف کھاتے ہیں اور ان کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو خدائی فرمان سمجھ کر سر جھکا دیتے ہیں۔ یہ اپنے کو علم الاعداد کا ہی نہیں بلکہ پوری کائنات کا سپر پاور سمجھتے ہیں، اپنی بڑائی ثابت کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اپنے سے نیچے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، زبان کے میٹھے ہیں، لیکن دل کے کالے ہیں۔

حضرت نو کی داہنی طرف حضرت آٹھ نقرئی کرسی پر تشریف فرما ہیں، یہ حضرت نو کے ہمراز و دم ساز ہیں، ہم نوالہ، ہم پیالہ، مشیر خاص اور سب سے بھروسہ مند ہیں۔ دونوں کے مزاج و انداز میں ہم آہنگی ہے، دونوں کی فطرت یکساں ہے، بس فرق ہے تو انیس بیس کا۔ ان میں انیس کون ہے، بیس کون ہے یہ وہی دونوں جانتے ہیں۔ ان پر بھی حضرت نو کی طرح خود پرستی اور برتری کا نشہ ہمیشہ سوار رہتا ہے۔ دور کی کوڑی لانے میں وہ ماہر ہیں، اس لیے حضرت نو کے منظور نظر ہیں، اپنے نیچے کے رتنوں کو یہ کبھی گھاس نہیں ڈالتے۔

حضرت نو کے بائیں جانب حضرت سات جیتی جاگتی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ ان کے جمال و جلال کی دھار کند ہو چکی ہے۔ یہ بھی نقرئی کرسی پر بیٹھے ہیں، لیکن ان کی کرسی میں وہ چمک دمک نہیں، نو رتنوں میں سب سے زیادہ عمر دراز ہیں، اس لیے سبھی رتن ان کی عزت کرتے ہیں، انہیں اپنی اوقات معلوم ہے، اس لیے گاہے بگاہے حضرت نو اور حضرت آٹھ کی چاپلوسی کر کے اپنا بھرم قائم رکھنے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔

پیچھے کی دوسری صف میں حضرت چھ اور حضرت پانچ شمشیر بکف کھڑے ہیں۔ ان کا کام اپنے سے اعلیٰ رتنوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا اور اپنے سے نیچے کے رتنوں پر تسلط قائم رکھنا ہے۔ ان کی وفاداری مسلم ہے۔ اعلیٰ رتن اگر دن کو رات کہہ دیں تو یہ سر تسلیم خم کر دیتے اور دن کو رات کہنے لگتے ہیں، یہ بھی اوپر والوں کی طرح نیچے والوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

تیسری صف میں حضرت چار سے لے کر حضرت ایک تک زمین پر بیٹھے ہیں۔ ان کی نہ اپنی کوئی سوچ ہے اور نہ کوئی فکر، یہ وہ بھیڑ بکری ہیں کہ انہیں جس طرف ہانکا جاتا ہے اسی طرف چل دیتے ہیں۔ ان کے کان وہی سنتے ہیں جو ان کے اوپر والے رتن سنانا چاہتے ہیں، ان کی آنکھیں وہی دیکھتی ہیں جو ان کے اوپر والے دکھانا چاہتے ہیں اور ان کے ہاتھ پاؤں یہ وہی کیا کرتے ہیں جو اوپر والے رتن کرانا چاہتے ہیں، گویا یہ اپنے اوپر والوں کے غلام ہیں۔

آخری صف میں زیرو ہاتھ جوڑے کھڑا ہے، اس پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ وہ اپنی اوقات بھول کر حضرت نو سے حضرت ایک تک کی حکم عدولی کر رہا ہے۔

حضرت نو سے لے کر حضرت ایک تک سبھی نو رتنوں میں ایک بات مشترک ہے کہ سبھی اپنے سے نیچے والے رتنوں سے بظاہر دوستی کا دم بھرتے ہیں، لیکن اندرونی طور پر اپنے سے تمام نیچے والے رتنوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سبھی کو اپنی برتری پر فخر ہی نہیں، غرور بھی ہے۔ زیرو (صفر) کو وہ اپنے پیر کی دھول کے برابر بھی نہیں سمجھتے اور اسے بے عزت کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ زیرو خاموشی سے تذلیل برداشت کرتا رہتا ہے، لیکن اب تو حد ہی ہو گئی ہے۔ آخر کوئی کب تک بے عزتی برداشت کر سکتا ہے۔ آج وہ بھی دل کی بھڑاس نکالنے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ تمام رتنوں کی بات سننے کے بعد اس نے کہا:

آزاد سونی پتی

1794, ABC Sector-15, Sonipat -131001 (Haryana) (Mob. 9255117015)

بچوں کی بیت بازی

پہلا گروپ

لیتے ہیں اللہ کا نام
دیش کے ہم ہیں اچھے بچے
ہوگا اب انصاف کا راج
ہوگا سب کا عزت مان
مل جل کر وہ کام کریں
ختم ہو رشوت کا بازار
پہن کے اک دن پولس کی وردی
بات ہم کرتے ہیں دو ٹوک
جس کو ہو درپیش سفر
شکر خدا کا کرے بشر
بے غیرت کو منھ نہ لگائیں

دوسرا گروپ

کرتے ہیں آغازِ کلام
نیک دل ہیں سچے بچے
نہیں کسی پر گرے گی گاج
یہ لیا ہے ہم نے ٹھان
دیش کا اُونچا نام کریں
چلے نہیں یہ کاروبار
ختم کریں گے غنڈہ گردی
سب کی مٹائیں گے ہم بھوک
کبھی نہ دیکھے اِدھر اُدھر
ہو جائے جیون بہتر
یعنی بات سے بات بتائیں

❀❀❀

’’آپ لوگوں کو جتنی بے عزتی کرنی تھی آپ نے کر لی......

مجھے اپنی حقیقت معلوم تھی، لیکن میں صرف اور صرف اس لیے خاموش تھا کہ آپ سے انصاف کی توقع رکھتا تھا، لیکن آپ لوگوں کی ڈکشنری میں انصاف نام کا کوئی لفظ نہیں ہے۔ میں آپ نو رتنوں کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ کی حقیقت نو سے ایک تک کی ہے۔ یہ میں ہی ہوں جو آپ کو دس گنا سے لے کر اُس حد تک پہنچا سکتا ہوں جہاں گنتی کی حد ختم ہو جاتی ہے، لیکن میرا جلوہ برقرار رہتا ہے۔ آپ سب اپنے گریباں میں جھانک کر دیکھئے، پھر اپنا اور میرا موازنہ نہ کیجئے اور جواب دیجیے کہ طاقت ور کون ہے۔ میں ہوں یا آپ؟‘‘

سچی بات کڑوی ہوتی ہے۔ زیرو کی باتوں کی سچائی کا سامنا کرنے کا حوصلہ نورتنوں میں نہیں تھا۔ سب نے شرم سے سر جھکا لیا۔

❀❀❀

محمد سراج عظیم
A-47, Zakir Bagh, Opp. Surya Hotel, Okhala Road, Jamia Nagar,
New Delhi -110025 (Mob. 9990661282)

چوں چوں عید مبارک

رشو اور نفو دونوں ہال سے لگی اوپن ٹیرس پر کھیلتے تھے۔ ٹیرس پر مختلف پھولوں اور گھریلو پودوں کے گملے قطار سے لگے ہوئے تھے۔ ٹیرس پر گلہریاں اور چڑیاں ٹہلتی رہتیں۔ وہاں کبھی کبھار بلی بھی ٹہلنے آجاتی تھی۔ چھت پر ایک کونے میں رشو اور نفو کی امی نے چڑیوں کے لئے دو مٹی کے پیالے رکھ دئے تھے۔ ایک میں پانی بھرا رہتا اور ایک میں دانہ رہتا، اس وجہ سے طرح طرح کی چڑیاں دانہ پانی دیکھ کر چھت پر آجاتیں اور ہر وقت چڑیوں کی چہچہاہٹ رہتی۔ رشو اور نفو بڑے خوش ہوتے۔ ان چڑیوں میں گوریا، جنگلی کبوتر، کوے، کبھی طوطے اور کوئل اور گرگچیا چڑیا بھی آجاتی۔ کبھی رشو کو چڑیوں کا زیادہ شوق چڑھتا تو ان کو پکڑنے کے لئے دوڑتے۔ چڑیاں فوراً اُڑ جاتیں، وہ مایوس ہوجاتے، اپنی امی سے افسردہ لہجے میں کہتے:

''ممی میں چڑیوں کو پکڑنے جاتا ہوں، تو اُڑ کیوں جاتی ہیں؟''

ان کی امی ان کو سمجھاتیں:

''بیٹا چڑیاں چھوٹی سی ہوتی ہیں نا۔ جب تم ان کے پاس جاتے ہو، تو وہ تم سے ڈر جاتی ہیں کہ کہیں تم انہیں کچھ نقصان نہ پہنچادو اور وہ اپنی جان بچانے کے لئے، پُھر سے اُڑ جاتی ہیں۔''

''ارے! ممی میں ان کو ماروں گا تھوڑی، میں ان کو اپنے ساتھ پنجرے میں رکھوں گا۔'' وہ فوراً جواب دیتے۔

''ہاں! ٹھیک ہے، مگر چڑیاں یہ نہیں سمجھتی ہیں نا بیٹا۔ وہ تو بس آدمیوں سے ڈر جاتی ہیں۔''

''ممی! میں ایک دن چپکے سے، یہ جو گرگچیا چڑیا ہے نا، اس کو پکڑ لوں گا، پھر دیکھئے گا۔ اب میں اس کو پنجرے میں بند کرکے اپنے پاس سلاؤں گا۔''

وہ بڑے جوش میں اپنی امی سے کہتے۔ ان کی امی ہنستیں اور کہتیں: ''ارے بیٹا! طوطا پالا جاتا ہے۔ وہ تمہاری بولی بھی سیکھ جاتا ہے۔ اس کو 'مٹھو بیٹا' کہتے ہونا تم، گرگچیا کوئی اچھی چڑیا تھوڑی ہوتی ہے۔''

''ارے! ممی آپ سمجھتی نہیں ہیں۔ طوطا تو میں پاپا سے مول منگالوں گا، مگر یہ گرگچیا بازار میں نہیں ملتی ہے۔ مجھے معلوم ہے، ایک بار میں پاپا کے ساتھ بازار گیا تھا۔ وہاں چڑیوں کی دکان پر گرگچیا نہیں تھی، اس لئے ممی میں گرگچیا پکڑوں گا۔''

رشو بڑی جلدی جلدی اپنی امی سے کہتے۔ بیچ میں نفو بھی امی اور رشو کی باتوں میں دخل اندازی کرتیں۔

''ممی بھیا صحیح کہہ رہا ہے۔ گرگچیا چڑیا بازار میں نہیں ملتی ہے۔ ممی یہ گرگچیا صبح میں اپنی چھت پر آتی ہے۔ میں اور بھیا کسی دن خاموشی سے چھت پر پنجرے کا دروازہ کھول کر دانے والے پیالے کے پاس رکھ دیں گے۔ وہ جیسے ہی پنجرے میں جائے گی۔ میں بھاگ کر اس کا دروازہ بند کردوں گی۔'' ان کی امی مسکراتے ہوئے کہتیں:

''ارے واہ! ہماری بیٹی تو بہت ہوشیار ہوگئی ہے۔ چلو بھیا! تمہاری آپا تمہارے لئے گرگچیا پکڑ دے گی۔''

''ہاں! ممی سچی! میں کوئی اس وقت تھوڑی پنجرہ رکھوں گی

جب گـرگچیا آئے گی، پہلے سے ہی رکھ دوں گی۔'' نفو اپنی امی کی مسکراہٹ کا مطلب سمجھتے ہوئے کہتی۔

''ہاں......ہاں! ممی، آپا صحیح کہہ رہی ہے۔ ممی ہم ایسے کریں گے اور اس کو پکڑ لیں گے۔'' رشو بڑے جوش میں کہتے۔

''ارے! بھیا تم لوگ جو چاہو کرنا ابھی تو کام کرنے دو۔'' ان کی امی جھنجھلا کر کہتیں۔

اس طرح کی باتیں نفو، رشو اور ان کی امی کے درمیان روز ہوتیں، مگر رشو پتا نہیں کیوں، گرگچیا پکڑنے کی ضد کرتے رہتے۔

ایک دن دونوں بچے چھت پر کھیل رہے تھے۔ صبح گیارہ بجے کا وقت تھا۔ بہت سی چڑیاں دانہ پانی چگ رہی تھیں۔ اس میں گـرگچیا بھی تھی۔ تبھی بلی وہاں بہت خاموشی سے پہنچ گئی۔ اس نے چڑیوں پر حملہ کر دیا۔ اس کے پنجے میں گـرگچیا آ گئی تھی۔ رشو اور نفو یہ دیکھ کر اچنبھے میں آ گئے۔ دونوں چیخنے لگے۔ ان کی امی اور پاپا دوڑتے ہوئے چھت پر آئے۔ ان کے پاپا چیختے ہوئے بولے:

''کیا ہوا بیٹا......!''

''پاپا......پاپا......وہ......وہ بلی نے گرگچیا......''

دونوں بچے گھبراہٹ میں بولے۔ دونوں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکے۔

''ارے ارے! بلی نے چڑیا کو پکڑ لیا'' کہتے ہوئے وہ اِدھر اُدھر کچھ تلاش کر رہے تھے کہ بلی کو مار کر چڑیا کو چھڑا لیں۔ اِدھر ان کی امی ہٹ ہٹ کر رہی تھیں۔ تبھی ان کے پاپا کو ڈنڈا مل گیا، انہوں نے وہ بلی کو پھینک کر مارا اور وہ ایک دم گـرگچیا کو چھوڑ، کود کر بھاگ گئی۔ گرگچیا زخمی حالت میں پڑی تھی۔ پاپا نے ان کی امی سے کہا:

''ارے جلدی سے روئی، پٹی اور ڈیٹول لے کر آؤ جلدی۔''

''پاپا! گرگچیا، مر گئی کیا۔'' دونوں بچے گھبرا کر بولے۔

''نہیں بیٹا! مری نہیں، لیکن بہت زخمی ہو گئی ہے۔ دیکھتے ہیں۔ اس کے مرہم لگا کر پٹی باندھتے ہیں۔ اللہ سے دعا کرو، چڑیا بچ جائے۔''

ان کے پاپا نے بتایا۔ اتنی دیر میں ان کی امی سب چیزیں لے آئی تھیں۔ ان کے پاپا نے جلدی جلدی زخم کو ڈیٹول سے صاف کر کے اس پر مرہم لگایا اور پٹی باندھ دی۔ ادھر رشو اپنی بہن سے کہہ رہے تھے:

''آپا! گرگچیا، زندہ بچ جائے گی۔''

''ہاں بھیا! اللہ میاں سے دعا کرو۔''

نفو بولی: ''اللہ پاک گـرگچیا کو ٹھیک کر دے۔ اللہ پاک!'' رشو نے بھی دعا کے لئے اپنے منے منے ہاتھ اٹھا دیئے۔

''اللہ میاں! میرے اللہ پاک! آپ گـرگـچیـا کو ٹھیک کر دیجئے۔'' نفو کی آنکھوں سے باقاعدہ آنسو بہہ رہے تھے۔ اتنی دیر میں پاپا نے گـرگـچیـا کی پٹی وغیرہ کر دی تھی اور اس کو ایک ڈبے میں رکھ دیا تھا۔ امی نے چھوٹی سی پیالی میں اس کو پانی پلایا۔ دونوں بچے خاموشی سے یہ سب دیکھ رہے تھے۔ اس کے بعد پاپا روز گـرگچیا کی پٹی کر دیتے۔ وہ اسی ڈبے میں دبکی رہتی، کہیں نہیں جاتی۔ وہ ٹھیک ہونے لگی تھی۔ رشو اور نفو اس کے آس پاس رہتے۔ دونوں اس سے باتیں کرتے:

''اے گـرگچیا، اب تمہارے درد تو نہیں ہے۔'' نفو کہتیں ''تم جلدی ٹھیک ہو جاؤ گی، اب رونا نہیں ہاں......''

رشو بڑی ہمدری کے لہجے میں چڑیا سے کہتے ہوئے غصہ کر رہے تھے۔ گـرگچیا بھی ان لوگوں کی بات سن کر چوں چوں کرتی جیسے سب کچھ سمجھ رہی ہو۔ جب وہ چوں چوں کرتی تو دونوں بچے بڑے خوش ہوتے۔ رشو کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں رہتا۔

کچھ دنوں کے بعد وہ ٹھیک ہو گئی اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی۔ ٹیرس پر بھی جاتی وہ دونوں بچوں کے آس پاس رہتی۔ دونوں طرح طرح کی باتیں کرتے۔ ایک دن گـرگـچیـا کہیں اُڑ گئی۔ رشو اور نفو دونوں بڑے اُداس ہو گئے۔ بچے اپنی امی سے اس کے بارے میں پوچھتے۔ ان کی امی بتاتیں وہ اپنے گھر اپنے ممی پاپا کے پاس چلی گئی، مگر ایک دن چھت پر گـرگـچیـا آ گئی اور دونوں بچوں کے پاس گھومنے لگی اور خوب چوں چوں کرنے لگی۔ رشو اور نفو کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ انہوں نے جلدی سے اپنی امی کو بلایا:

''ممی! گرگچیا آ گئی، دیکھئے چوں چوں کر رہی ہے۔''

''ارے واہ! آ گئی، اب خوش......'' ان کی امی پاس آتے ہوئے بولیں۔ اس کے بعد سے پھر گرگچیا روز چھت پر آنے لگی، رشو اور نفو کے پاس آ کر چوں چوں کرتی، جیسے پوچھتی ہو کہ سب ٹھیک ہے،

محسن باعشن حسرتؔ
4, Princep Street, First Floor, Kolkata- 700072 (Mob. 8777567705)

اُستاد

سکھلاتے ہیں تہذیب یہ ، دیتے بھی ہیں تعلیم — ہے فرض ہمارا ، کریں اُستاد کی تعظیم
سچائی کی راہوں پہ چلاتے ہیں یہ ہم کو — جی جان سے روزانہ پڑھاتے ہیں یہ ہم کو
دل میں نہ رکھیں ان کے لئے ہم کبھی نفرت — ہر حال میں اُستاد کی ہم سب کریں عزت
اُستاد ہمیں علم کے زیور سے نکھارے — اسکول کی ہیں شان یہ اُستاد ہمارے
پوشیدہ نہیں بات یہ ، ہم سب پہ عیاں ہے — اُستاد میں تعلیم کا اک دریا رواں ہے
آؤ یہ کریں وعدہ ، کریں گے نہ خطا ہم — اُستاد کی ہر بات کو مانیں گے سدا ہم

❁❁❁

یہ دونوں بڑے خوش ہوتے ۔ اب گرگچیا رشو سے نہیں ڈرتی تھی ، ان کے آس پاس رہتی ، وہ اس سے طرح طرح کی باتیں کرتے رہتے ، وہ کچھ کہتے تو گرگچیا چوں چوں کرتی ، ایسا لگتا وہ ان کی باتیں سمجھتی ہے اور چوں چوں کرکے جواب دیتی ہے اور رشو! وہ اپنی دُھن میں اس سے مستقل کچھ نہ کچھ کہتے رہتے ۔

رمضان شروع ہونے والے تھے ۔ گھر کی پتائی وغیرہ چل رہی تھی ۔ ٹیرس پر سارا سامان پھیلا ہوا تھا ۔ چڑیاں ، گلہریاں آتیں ، ٹیرس کو بھرا دیکھ اِدھر اُدھر بیٹھنے کی کوشش کرتیں اور چلی جاتیں ۔ گرگچیا نے آنا بالکل بند کر دیا تھا ۔ رشو روز اپنی امی سے پوچھتے : ''کب تک گھر میں پینٹ ہوگا ۔ گرگچیا نہیں آرہی ہے ۔ ممی میں کس سے باتیں کروں ۔''

ان کی امی انہیں بہلا دیتیں : ''بھیا جلدی ہوجائے گا ۔''

گھر پینٹ ہو گیا ۔ چھت بھی خالی ہوگئی اور رمضان کے دن بھی شروع ہوگئے ، مگر گرگچیا نہیں آئی ۔ روز رشو نفو امی سے کہتے :

''ممی گرگچیا کیوں نہیں آرہی ہے ؟'' ان کی امی کہتیں :

''بیٹا کہیں دور چلی گئی ہوگی اس وجہ سے نہیں آتی ہوگی ۔ کبھی کبھی رشو رونے لگتے ۔ اسی طرح پورے رمضان گزر گئے گرگچیا کو نہ آنا تھا نہ آئی ۔

عید کا دن آگیا ۔ رشو اور نفو نئے کپڑے پہن کر اپنے پاپا کے ساتھ عید گاہ گئے ۔ جب عید کی نماز ختم ہوگئی اور امام صاحب دعا مانگنے لگے تو رشو کے کانوں میں چوں چوں کی آواز آئی ۔ انہوں نے اوپر پیڑ کی طرف دیکھا تو وہ گرگچیا کو دیکھتے ہی پہچان گئے ۔ زور سے چیخ کر بولے :

''ارے آپا ، دیکھو گرگچیا آگئی ۔ چوں چوں کر رہی ہے ۔''

ایسا لگا جیسے گرگچیا نے بھی رشو کی آواز سن لی ہو ۔ وہ ایک دم اُڑ کر نیچے آئی ۔ پہلے پاپا کے کندھے پر ، پھر نفو کے ، بعد میں رشو کے کندھے پر بیٹھی چوں چوں کرتی رہی ۔ رشو کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا ۔ نفو بھی بڑی خوش تھیں ۔ تبھی گرگچیا نے دوبارہ زور سے چوں چوں کی اور اُڑ گئی ۔ آس پاس بیٹھے سارے لوگ حیرت سے یہ دیکھ رہے تھے ۔ رشو کے پاپا کو بھی حیرت تھی ۔ گرگچیا اُڑ گئی تو رشو اور نفو اُداس دکھنے لگے ۔ ان کے پاپا سمجھ گئے کہ دونوں بچوں کو گرگچیا کے اُڑنے کا افسوس ہے ۔ وہ بولے :

''بیٹا ! معلوم ہے گرگچیا چوں چوں کرکے تمہیں عید کی مبارکباد دے رہی تھی ۔''

''سچ پاپا......!'' رشو خوش ہوتے ہوئے بولے اور رشو نفو کے چہرے خوشی سے کھل اُٹھے ۔ ❁❁

علی عامر

Sultanganj, Patna - 800006

صلہ رحمی

بغداد شہر میں پھلوں کی اُس دکان کا مالک بہت ہی نیک اور ایماندار تھا۔ایک روز اُس کی دکان میں ایک خریدار آیا اور پوچھنے لگا:

''کیلا کیسے درجن ہے اور سیب کیسے کیلو ہے؟''

''کیلے ایک درجن بارہ درہم کے ہیں اور سیب ایک کیلو دس درہم کے ہیں۔''

اُسی وقت ایک عورت بھی اُسی دکان میں داخل ہوئی اور ایک کیلو سیب اور ایک درجن کیلے کی قیمت پوچھنے لگی۔دکاندار نے اسے بتایا کہ کیلے ایک درجن تین درہم کے ہیں اور سیب دو درہم کا ایک کیلو۔

''مجھے ایک درجن کیلا اور ایک کیلو سیب دے دیں۔''

دکان میں پہلے سے موجود اُس گاہک نے دکاندار کو غصہ بھری خوفناک نظروں سے دیکھا،مگر منھ سے کچھ بولا نہیں۔اس کے قبل کہ وہ دکاندار کو کچھ کہتا،دکاندار نے گاہک کو آنکھ مارتے ہوئے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دکاندار نے جلدی جلدی اُس عورت کو ایک درجن کیلا اور ایک کیلو سیب دے دیا۔عورت نے دکاندار کو رقم دی اور بہت خوشی خوشی دکان سے نکلتے ہوئے بولی:

''اے اللہ تیرا بڑا شکر ہے...... میرے بچے انہیں کھا کر بہت خوش ہوں گے۔''عورت کے جانے کے بعد دکاندار پہلے سے موجود گاہک کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہنے لگا:

''اللہ گواہ ہے،میں نے تجھے کوئی دھوکا دینے کی کوشش نہیں کی ہے۔یہ عورت چار یتیم بچوں کی ماں ہے۔وہ کسی سے بھی مدد نہیں مانگتی ہے۔میں نے اُس کی کئی بار مدد کرنے کی کوشش کی،لیکن ہر بار اُس نے کسی بھی طرح کی مدد لینے سے انکار کر دیا،تب میں نے یہ بہتر سمجھا کہ وہ جب بھی میری دکان میں آئے تو اُسے کم سے کم قیمت میں سامان دے دوں،تاکہ اس کا بھرم قائم رہے اور اسے لگے کہ وہ کسی کی محتاج نہیں ہے۔میں نے یہ تجارت صرف اللہ کی رضا و خوشنودی کی طلب کی خاطر کی ہے۔''

دکاندار نے اُس گاہک کو بتایا کہ جس دن وہ عورت میری دکان میں آتی ہے،اللہ گواہ ہے کہ اُس دن دکان کی بکری بہت بڑھ جاتی ہے اور اللہ کی رضا سے منافع دوگنا ہو جاتا ہے۔

ان سب باتوں کو سن کر اُس گاہک کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے دکاندار کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ ایک دم صحیح بات ہے کہ لوگوں کی مدد کرنے میں جو خوشی ملتی ہے اسے وہی جان سکتا ہے جس نے ایسا کیا ہو،اسی کا نام صلہ رحمی ہے۔ ❁❁

نصیحت

مختار احمد عاصی

قناعت کا دلوں میں نور رکھنا — ہوس سے زندگی کو دور رکھنا
یہی پہچان ہے اہل وفا کی — مصیبت ہو تو دل مسرور رکھنا
بہر صورت رہے صبر و قناعت — غریبی سے نہ دل رنجور رکھنا
کوئی بھی مرحلہ ہو زندگی کا — خدا کا سامنے دستور رکھنا
بہت مقبولِ رب ہے یہ عبادت — خیالِ بے کس و مجبور رکھنا
خدا بخشے اگر کچھ علم و ثروت — کبھی مت جذبہ مغرور رکھنا

اس رات کی تقدیس کو قرآن سے پوچھو   اس رات کی تکریم مسلمان سے پوچھو
اس رات کا انعام ، یہ رضوان سے پوچھو   اس رات میں کھو جاؤ جو جنت کی طلب ہے

ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

اس رات میں بس ذکر خدا وردِ زباں ہے   توبہ ہے ، تلاوت ہے ، نمازیں ہیں ، اذاں ہے
شیطان کی وہ گرمئ بازار کہاں ہے   بے چارہ اسی شب کے سبب جان بلب ہے

ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

یہ رات طلب کرتی ہے سرمایۂ طاعت   یہ رات طلب کرتی ہے دریائے ندامت
یہ رات طلب کرتی ہے اخلاص کی دولت   اس رات کی قیمت نہ حسب ہے نہ نسب ہے

ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

بخشش کو طلب ہے کہ گنہگار کہاں ہے   توبہ ہے تلی ، آئے خطا کار کہاں ہے
رحمت ہے کھڑی ، میرا مستیا- کہاں ہے   یہ رات ہے وہ جس کا شب قدر لقب ہے

ہاں قدر کرو قدر کرو قدر کی شب ہے
یہ رات تو مومن کے لئے تحفۂ رب ہے

(تصویر اور نظم بشکریہ فرزند روحؔ جناب جمال کاکوی، پٹنہ)

اشعارِ روحؔ

حیات موت سے پہلے ، حیات موت کے بعد   عجیب ربط نہاں موت کا حیات سے ہے
میں مشت خاک سہی ، میری کائنات ہی کیا   مقابلہ تو مگر ساری کائنات سے ہے

•••

ہاتھ پھیلانے سے پہلے ہی یہ سوچا ہوتا   سر اٹھاتا نہیں احسان اُٹھانے والے

•••

دل خون رو رہا ہو ، مگر آنکھ تر نہ ہو   اے ضبط! گھر کی بات ہے باہر خبر نہ ہو

•••

زندگی ایسی کٹی ، ویسی کٹی ، جیسی کٹی   مختصر یہ ہے بہرصورت گزارا ہوگیا
کتنی عظمت بڑھ گئی ان کی کہ اب ان کا بھی نام   لفظ قاتل کے لئے اک استعارہ ہوگیا

•••

سفر ہے یہ زندگی نو کا ، یہ کوچ سوئے عدم نہیں ہے   کسی سے ملنے کی ہیں امیدیں، کسی سے چھٹنے کا غم نہیں ہے

ZABAN-O-ADAB

Monthly Journal of Bihar Urdu Academy

(Under The Department of Minority Welfare, Govt. Of Bihar)

Registered with Registrar, News Paper of India R.N.No.- 26469/75

SSPOST Regd. No.- PT- 58 upto- 31-12-2026

Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Ashok Rajpath, Patna - 800004

Volume : 45 **April - 2024** **No. 04**

شوکت حیات

کلام حیدری

ایڈیٹر، پبلشر ابرار احمد خان، سکریٹری بہار اردو اکادمی نے پاکیزہ آفسیٹ پریس، شاہ گنج، درگاہ روڈ، پٹنہ۶ ۸۰۰۰۰ میں
طبع کرا کے دفتر بہار اردو اکادمی، اردو بھون، اشوک راج پتھ، پٹنہ۴ ۸۰۰۰۰ سے شائع کیا

Printed and published by *Ibrar Ahmad Khan* Editor & Secretary Bihar Urdu Academy,
on behalf of Bihar Urdu Academy, Urdu Bhawan, Patna-4 through Pakiza Offset Press
Shahganj, Dargah Road, Patna - 800006

Rs. 15